تفسیر آیتِ کریمہ

مترجمہ

تالیف
شیخ الاسلام الامام ابنِ تیمیہ علیہ الرحمۃ

تقدیم و تنقیح
مَحمُود اَحمَد غضنفر

مکتبہ ابن تیمیہؒ
لاهور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

تفسیر

آیت کریمہ

تالیف

شیخ الاسلام الامام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ

تقدیم و تنقیح

محمود احمد غضنفر

مکتبہ ابن تیمیہ

لاھور پاکستان

نام کتاب : تفسیر آیت کریمہ

مؤلف : شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ ؒ

مترجم : مولانا عبدالرحیم حفظہ اللہ

تقدیم : محمود احمد غضنفر

سرورق وعنوانات : عبدالرشید قمر

ناشر : مکتبہ ابن تیمیہ

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

ملنے کا پتہ

مکتب الدعوۃ الاسلامیۃ

۵۸ - ابوبکر بلاک نیو گارڈن ٹاؤن

لاہور ، پاکستان

فہرست مضامین

تیسرا باب — خاصیت وحکمتِ دعائے یونس علیہ السلام

پانچواں باب — دعائے یونس اور توحیدِ الوہیت

چھٹا باب — عصمتِ انبیاء علیہم السلام

ساتواں باب — ذریعہ محبوبیتِ خداوندی

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ الحرّانی رحمہ اللہ

شجرۂ نسب | تقی الدین ابو العباس احمد بن شہاب الدین ابو المحاسن عبد الحلیم بن مجد الدین ابو البرکات عبد السلام بن ابو محمد عبد اللہ بن ابو القاسم الخضر بن علی بن عبد اللہ یہ خاندان، خاندان ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہے۔

وجہ تسمیہ | امام صاحب علیہ الرحمۃ کی دادی بہت بڑی واعظہ تھی، ان کا نام تیمیہ تھا، اسی مناسبت سے اس خاندان کا نام "خاندانِ ابن تیمیہ" پڑ گیا۔

ولادت | امام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ کی ولادت ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو حرّان نامی بستی میں ہوئی۔

ابتدائی حالات | چھ سال کی عمر تک امام صاحب اسی بستی میں مقیم رہے، ابھی عمر کے ساتویں سال میں تھے کہ تاتاریوں نے اس بستی پر غارت گری کی۔ ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر یہاں کے باشندوں نے سکونت ترک کر کے ادھر ادھر پناہ لینا شروع کی۔ خاندانِ ابن تیمیہ کے کچھ لوگ ہجرت کر کے دمشق کی طرف بڑھے۔ لیکن راستہ انتہائی پرخطر تھا۔ نہ امن میسر تھا نہ سکون۔ اس ذہنی پریشانی کے ساتھ ساتھ راستہ کی دشوار گزاری اور زیادہ تکلیف کا باعث تھی، رات کی تاریکیوں میں سفر جاری رکھنے والے یہ لوگ ایک خانوادۂ علم کے افراد تھے۔ ہر آن یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں دشمن سر پر نہ پہنچ جائے، لیکن اللہ نے دستگیری فرمائی اور قافلہ ظالموں اور سفاکوں سے بچتا بچاتا منزل مقصود تک پہنچ ہی گیا۔

تعلیم و تربیت | چونکہ امام تقی الدین ابن تیمیہ کا خاندان علم میں ایک ممتاز مقام رکھتا

تھا۔ اس علمی گہوارہ میں آپ نے آنکھ کھولی، بچپن ہی سے علم کی طرف راغب ہو گئے چھوٹی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا، شوقِ تلاوت کا یہ عالم تھا کہ جیل کی زندگی میں ۸۰ سے زیادہ قرآن مجید ختم کیے۔ قرآن مجید ختم کر لینے کے بعد حدیث اور لغت کی طرف متوجہ ہوئے، احکامِ فقہ کی معرفت حاصل کی۔ اور ان کا بڑا حصہ ازبر کر لیا۔

امام صاحب کے والد شیخ الحدیث کے مقام پر فائز تھے، چنانچہ امام صاحب نے صحیح بخاری، مسلم، مسند امام احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی کی بار بار سماعت کی، حدیث میں سب سے پہلے کتاب جو امام صاحب نے حفظ کی وہ امام حمیدی کی کتاب الجمع بین الصحیحین ہے۔ امام صاحب کے بعض معاصرین کا بیان ہے کہ آپ نے جن شیوخ سے سماعت کی، ان کی تعداد ۲۰۰ سے متجاوز ہے۔ حدیث کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم وفنون کے حصول پر بھی توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ علوم ریاضی میں خاصی دسترس حاصل کی۔ علوم عربیہ کی طرف خاص طور پر زیادہ توجہ کی۔ یہ علوم تو اس طرح حاصل کیے جیسے یہی ان کا منشا اور مقصد تھا۔ چنانچہ عربی زبان کا بہت سا کلام نظم اور نثر زبانی حفظ کر لیا۔ جنگ و پیکار کی تاریخ پر عبور حاصل کیا۔ مسلمانوں کے عہدِ زریں کے حالات و کوائف کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا، عروج و زوال کی داستانیں پڑھیں اور ان کے اسباب و علل کو گہری نظر سے دیکھا، فن نحو میں خصوصی دسترس حاصل کی، کتاب سیبویہ آپ کو زبانی یاد تھی، ان علوم وفنون کے ساتھ فقہ حنبلی کا درس بھی جاری تھا، ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ امام صاحب علوم وفنون میں غیر معمولی طور پر مصروف و منہمک تھے، اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ دل و جان سے تفسیرِ قرآن کے اسرار و رموز کی گرہ کشائی میں لگے ہوئے تھے قرآن فہمی کے لیے تمام متعلقہ علوم و کتب کھنگال ڈالیں۔ ایک ایک حرف کا پوری توجہ سے مطالعہ کیا۔

امام صاحب کی ہمہ گیری اور جامعیت | مختصر یہ کہ امام ابن تیمیہؒ نے اپنے ذہن ودماغ کی تربیت بہت عمدہ طور پر کی، انہوں نے وہ تمام علوم حاصل کیے جو ان کے زمانے میں رائج تھے، علم کا کوئی ایسا مرکز نہ تھا جس کے دروازے پر دستک نہ دی ہو۔ امام صاحب کے ایک ہم عصر علامہ کمال زملکانیؒ نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے امام ابن تیمیہؒ کے لیئے علوم کو اس طرح کر دیا تھا، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا، جب کسی علم و فن کے بارے میں ان سے سوال کیا جاتا تو دیکھنے سننے والوں کو ان کی رائے سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس فن کے سوا امام صاحب کچھ اور نہیں جانتے اور یہ کہ اس فن میں امام صاحب کا کوئی حریف و مقابل نہیں۔ ہر مکتب خیال کے فقہاء کرام جب آپکے دربارِ علم میں حاضر ہوتے تھے تو خود اپنے مسلک کے بارے میں ان کے ہاں ایسی باتیں حاصل کرتے تھے، جن سے اب تک وہ خود ناواقف تھے اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی شخص سے وہ مناظرہ کریں اور لاجواب ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہر علم پر ماہرانہ گفتگو کرتے تھے خواہ وہ شرع و دین سے تعلق رکھتا ہو یا دنیاوی فنون سے متعلق ہو، جس علم پر بھی گفتگو کرتے تھے، معلومات سے اس علم کے ماہروں کو بھونچکا کر دیتے تھے۔"

کیا امام ابن تیمیہؒ عرب تھے؟ | مورخین نے کسی ایسے قبیلے کا ذکر نہیں کیا، جسے خاندانِ ابن تیمیہؒ کی جڑ قرار دیا جا سکے، وہ حران شہر کے رہنے والے تھے، اسی نسبت سے امام صاحب حرانی کہلائے، مورخین نے قبائلِ عرب میں سے کسی قبیلہ کی طرف امام صاحب کو منسوب نہیں کیا، اس سے ثابت ہوا کہ امام موصوف عربی نہیں

تھے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ وہ کُردی تھے۔ کرد قوم بڑی بہادر، باحوصلہ اور عالی ہمت قوم ہے۔ اس قوم کے کردار و سیرت میں قوت کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور آتش خوئی کا بھی اور یہ تمام صفات امام صاحب میں واضح اور نمایاں طور پر موجود تھیں اگرچہ ان کی نشو و نما ایسے لوگوں میں ہوئی تھی جو علم و فضل، دانش و بینش، تحقیق و تدقیق اور غور و فکر کے مرد میدان تھے۔

محرابِ علم سے میدانِ جہاد کی طرف امام ابن تیمیہؒ سکون سے اپنے فرائض کی بجا آوری میں مصروف تھے، وہ مدرسہ میں درس دیتے اور تحقیق و تدقیق کے جوہر دکھاتے، مسجد میں وعظ و ارشاد کی محفلیں برپا کر کے سننے والوں کے قلوب میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرتے۔ وعظ و ارشاد کی مجلس میں ان کا بیان آبِ کوثر کی طرح پاک اور صاف ہوتا۔ لوگوں کے سامنے وہی دین پیش کرتے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ لیکن اس درس و تدریس کے ساتھ ساتھ جذبۂ جہاد اسی طرح قائم رہا۔ حق و صداقت کے لیے سینہ سپر رہتے۔ جو بات خلافِ حق نظر آتی اس کے خلاف ڈٹ جاتے، حکام و عمال کے پاس پہنچتے اور فریضۂ تبلیغِ حق سے عہدہ برآ ہوتے۔ امام موصوف علیہ الرحمۃ بیک وقت صاحبِ علم و قلم اور صاحبِ سیف مجدد تھے۔

عشقِ رسولؐ کی چنگاری ۶۹۳ھ میں باوثوق ذرائع سے امام صاحب تک یہ خبر پہنچی کہ ایک نصرانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی ہے پھر وہ رائے عامہ کے اشتعال سے خوف زدہ ہو کر ایک بدوی کے گھر پناہ گزین ہو گیا ہے۔ اس نے عوام کے جوشِ غضب سے اس کی حفاظت کی۔ امام صاحب کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ جس پر سکوت کسی طرح بھی اختیار نہ کیا جا سکتا تھا چنانچہ وہ دمشق کے نائب السلطنت کے پاس پہنچے اور اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے نصرانی کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وہ حاضر ہوا۔ اس کے ساتھ وہ بدوی بھی تھا جس نے اسے

پناہ دے رکھی تھی، بدوی نے مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف دشنام طرازی شروع کر دی، لوگ مشتعل تو تھے ہی، انہوں نے نصرانی بدوی اور اس کے ساتھیوں پر سنگ باری شروع کر دی۔ حاکم دمشق نے امام صاحب سے اس الزام میں کہ انہوں نے لوگوں کو نصرانی کے خلاف بھڑکا کر امن عامہ کو درہم برہم کیا تھا، تشدد کا برتاؤ کیا اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ درس و تدریس کی پابندیوں نے بھی اس مردِ جلیل کو دین و مذہب کے مسائلِ عامہ سے مستغنی اور بے پرواہ نہیں کر رکھا تھا، وہ دین کی حمایت و نصرت کے لیے کسی سے بھی ٹکر لینے سے جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، وہ درس کے حلقہ سے اٹھ کر میدان میں آتے اور دشنام رسول کے مجرموں کے خلاف عوام کی رہنمائی کرتے اور اس سلسلہ میں جو تکلیف، پریشانی یا مصیبت آتی اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔

تصنیفات شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی عمر سترہ سال کی تھی جب انہوں نے قلم سنبھالا۔ پینتالیس سال کی عمر تک یہ قلم پورے زور سے رواں دواں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی حافظہ، محیر العقول ذکاوت اور ندرت افزا فہم سے نوازا تھا، سرعت قلم کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک ہی دن میں علمی اور تحقیقی رسالہ مرتب کر دیتے، لوگ مشکل مسئلے لے کر آجاتے اور امام موصوف جواب میں کئی کئی صفحات لکھ دیتے، ان حالات میں کیسے صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی میں آپ نے کیا کچھ لکھا اور اگر آپ کی تمام کتب کو مرتب کیا جائے تو کتنے ہزار صفحات بن جائیں، یہی اور اس قسم کی دوسری ممتاز خصوصیات تھیں جن کی بناء پر آپ اپنے عہد میں مرجع عالم شخصیت قرار پائے تھے اور اگرچہ وفات پر نویں صدی گزر رہی ہے تاہم آپ کی ہر تحریر کو آج بھی جو بلند مقام حاصل ہے اس کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ اب۔ حافظ ذہبی علیہ الرحمۃ نے امام موصوف کی زندگی ہی میں ایک مرتبہ تحریر فرمایا کہ آپ کی تصانیف

کی تعداد پانچ سو تک جا پہنچی ہو تو بعید نہیں " اس کے بعد غالباً بعداز وفات لکھا کہ:
" ہزار سے اوپر تعداد ہو گئی ہے "

تصنیفات کے نام اگر دیکھنا مقصود ہوں تو "حیاتِ شیخ الاسلام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ" شائع کردہ مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف مراجعت فرمائیں۔ بلا شبہ امام صاحب کی زندگی پر یہ ایک مبسوط کتاب ہے۔ میں نے بھی اسی کی خوشہ چینی کر کے امام صاحب کی زندگی کی چند جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کی ہیں۔

تلامذہ امام ابن تیمیہؒ کے دور میں ہمیں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو شاگردوں کی زیادتی میں شیخ تقی الدین ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ ہو۔ مصر و شام میں اور پھر مصر کے اندر اسکندریہ اور قاہرہ کے مابین ان کے شاگردوں کی تعداد حدِ شمار سے خارج تھی، لیکن مخصوص شاگرد جنہوں نے صحیح معنوں میں آپ کی جانشینی کے فرائض سرانجام دیے، ان کے نام درج ذیل ہیں:

نمبر شمار	نام	ولادت	وفات
۱	حافظ ابن قیم الجوزی علیہ الرحمۃ	۶۹۱ھ	۷۵۱ھ
۲	حافظ ابن الہادی علیہ الرحمۃ	۷۰۵ھ	۷۴۴ھ
۳	حافظ ابن کثیر علیہ الرحمۃ	۷۰۱ھ	۷۷۴ھ
۴	حافظ علامہ ذہبی علیہ الرحمۃ	۶۷۳ھ	۷۴۸ھ
۵	محمد بن مفلح علیہ الرحمۃ	-------	۷۶۳ھ
۶	ابن قاضی الجبل علیہ الرحمۃ	-------	۷۷۱ھ
۷	ابو حفص ابزار علیہ الرحمۃ	-------	۷۴۹ھ
۸	ابن سعد اللہ حرانی علیہ الرحمۃ	-------	۷۴۹ھ
۹	ابن الوردی علیہ الرحمۃ	-------	۷۴۹ھ
۱۰	الدباہی الزاہد علیہ الرحمۃ	-------	۷۱۱ھ
۱۱	قاضی ابن فضل اللہ علیہ الرحمۃ	-------	۷۴۹ھ

یہ وہ کبار شاگرد ہیں جنہوں نے امام ابن تیمیہ سے فیضِ علم حاصل کیا اور صحیح معنوں میں آپ کے جانشین بنے۔

سفرِ آخرت ہنگامہ خیز زندگی گزارتے ہوئے بالآخر وہ وقت آ ہی گیا، جو ہر ذی روح کی انتہا کہلاتا ہے، اللہ سبحانہ نے امام صاحب کی روح کو اپنے حضور طلب کر کے اپنی خوشنودی اور رضا کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

۲۰، ذوالقعدہ ۷۲۸ھ / ۱۳۲۸ء کو امام صاحب اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ امام صاحب کے بھائی زین الدین عبدالرحیم کا کہنا ہے کہ پانچ ماہ کی مدت میں ہم دونوں نے اسّی ۸۰ قرآن مجید بطور دَور ختم کیے۔ تین پارے روزانہ کا معمول تھا۔ ۸۱ ویں مرتبہ شروع کر کے سورۃ القمر کی آیت إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ۝ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ تلاوت کر رہے تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کم و بیش بیس دن بیمار رہے۔ لیکن جیل سے باہر عام طور پر بیماری کی اطلاع نہیں ہوئی۔ سوموار کی رات ۲۰، ذیقعدہ کو سحری کے وقت انتقال ہوا، خبرِ وفات کا اعلان قلعہ (جس میں آپ محبوس تھے) کے مینار سے علی الصباح کر دیا گیا۔ اس ناگہانی خبر سے کہرام مچ گیا۔ سارے شہر میں صفِ ماتم بچھ گئی، بازار بند ہو گئے، دکانوں پر کھانا تک اس دن نہیں پکا۔ زیارت کرنے والے لوگوں کا ہجوم قلعہ کے پاس ہو گیا، قلعے کا دروازہ کھول کر داخلے کی عام اجازت دے دی گئی، علماء، وزراء، امراء، عوام، اقارب سب امام صاحب کے پاس آتے تھے اور زار و قطار روتے تھے، زیارت کے لیے پہلے مرد آئے پھر عورتیں آئیں، غسل کے وقت سب لوگ چلے گئے۔ صرف غسل دینے والے علماء و اعیان کی ایک جماعت رہ گئی، جن میں مشہور اور جلیل القدر محدّث اور آپ کے خاص معتقد ابوالحجاج بھی تھے۔

غسل کے بعد جنازہ اٹھایا گیا، ہجوم بہت زیادہ ہو گیا۔ قلعہ میں پہلی نمازِ جنازہ شیخ محمد بن تمام نے پڑھائی۔ اس کے بعد جنازہ جامع اموی میں لایا گیا۔ نمازِ ظہر کے بعد جنازہ کی نماز پڑھی گئی جس کی امامت نائب الخطابہ شیخ علاؤالدین بن الخراط نے کرائی۔ پھر وہاں سے جنازہ اٹھا، ہجوم اس قدر تھا کہ شہر کا شہر امڈ کر آ گیا تھا، عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ معذوروں کے سوا سب ہی اہلِ شہر جنازہ کے ساتھ شامل تھے۔ آنکھیں اشکبار تھیں۔ مدحیہ و دعائیہ کلمات زبانوں پر تھے، ہر ایک فرطِ عقیدت سے جنازہ سے مس کرنا چاہتا تھا۔ شدتِ اژدحام کی وجہ سے جنازہ کی حفاظت و انتظام کے لیے فوج کو جنازہ گھیرے میں لینا پڑا۔ ہجوم لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی گیا، دمشق سے باہر ایک وسیع میدان میں جنازہ رکھ دیا گیا۔ تیسری نمازِ جنازہ علامہ زین الدین عبدالرحمٰن نے پڑھائی اور عصر کے قریب اس آفتابِ علم اور مجددِ ملت کو اپنے بھائی شرف الدین عبداللہ کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔

جنازہ پر تقریباً دو لاکھ کی حاضری کا اندازہ کیا گیا ہے۔ ۱۵ ہزار عورتوں کا تخمینہ اس کے علاوہ ہے۔ دمشق کی تاریخ میں اس قسم کے جنازہ کی مثال نہیں ملتی۔

ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

محمود احمد غضنفر

فروری : ۱۹۸۴ م

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

حامداً ومصلیاً

یہ کتاب "تفسیرِ آیتِ کریمہ" شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ نے ان آٹھ سوالوں کے جواب میں لکھی جو ایک سائل نے آیت کریمہ کے ضمن میں پیدا ہونے والے سوال امام ممدوح کی خدمت میں پیش کیے تھے۔ یہ سوالات اسی کتاب کی تمہید میں بالترتیب ذکر کر دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب امام صاحبؒ نے عربی میں تحریر فرمائی، جس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالرحیم مرحوم ناظم دارالعلوم پشاور نے کیا، تاکہ عوام الناس پوری طرح اس سے استفادہ کر سکیں۔ چونکہ یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی، بڑی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اسے حاصل کر کے دوبارہ منظرِ عام پر لایا جائے۔ لہٰذا سے از سرِ نو ترتیب دیا گیا اور دوبارہ موجودہ دَور کے تقاضوں کے مطابق مکتبۂ ابنِ تیمیہؒ کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب میں جاذبیت پیدا کرنے کے لیے اسے سات ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ عام فہم بنانے کے لیے جلی اور ذیلی عنوان قائم کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں حاشیہ آرائی نے اسے مزید آسان بنا دیا ہے تاکہ ہر خاص و عام اس سے پوری طرح استفادہ کر سکے۔ ابتداء میں مضامین کی فہرست کے بعد شیخ الاسلام

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی بھی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ کتاب پڑھنے سے پہلے مطالعہ کرنے والے کے ذہن پر مصنف کی ہمہ گیر شخصیت کا اثر پڑ سکے ، ویسے تو امام صاحب علیہ الرحمۃ کا نام ہی اپنے اندر کشش اور جاذبیت رکھتا ہے ۔ کسی کتاب پر آپ کا نام دیکھ لینے کے بعد ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ کسی سے اس کتاب کا تعارف کرایا جائے ، آپؒ کا نام ہی اس کتاب کے مستند ہونے پر ایک دلیل ہے ۔

آخر میں قارئین کرام سے اپیل ہے کہ بندۂ عاجز کے حق میں دعا فرمائیں ۔ اللہ تعالیٰ مجھے دینی علوم کی خدمت کرنے اور اس قسم کے ذخائرِ علمیہ کو تلاش کر کے ہر خاص و عام تک پہنچانے کی توفیق بخشے ۔ آمین !

خاکسار :-

محمود احمد غضنفر

فروری : ۱۹۸۴ ء

تفسیر

آیتِ کریمہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ
اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

ترجمہ: (اے پروردگار) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک و بے عیب ہے
بے شک میں ہی ظالموں سے ہوں

تمہید

سوال کسی شخص نے شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ یہ جو احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

دعوة اخی ذی النون لا اله الا انت سبحنك انی كنت من الظلمين ما دعا بها مكروب الا فرج الله كربته

میرے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کی دعا لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین“ کے ذریعے جو کوئی بھی مصیبت زدہ دعا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کر دے گا۔

حضرت! آپ فرمائیں اس بارے میں آپ کا کیا ارشاد ہے۔ اس سلسلہ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب باصواب دے کر ممنون فرمائیں۔ عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں۔ سوالات درج ذیل ہیں:

۱۔ ان الفاظ کو لفظِ دعا سے تعبیر کرنے کے کیا معنی ہیں؟

۲۔ دعا کے ان الفاظ میں مصیبت دور کرنے کی کون سی طاقت ہے؟

۳۔ جب آدمی یہ الفاظ منہ سے نکالے تو کیا ان کے ذریعے درجہ پذیرائی حاصل کرنے کے لیے کسی باطنی شرط کا ہونا لازمی ہے؟

۴۔ مصیبت دور کرنے کی خاصیت ان الفاظ میں کیونکر رکھی گئی ہے؟

۵۔ "انی کنت من الظلمین" کے الفاظ کو توحید کے ساتھ کونسی مناسبت ہے جس کی بنا پر ان دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا ہے؟

۶۔ کیا توبہ کی مقبولیت کے لیے صرف اپنے گناہ کا اعتراف کر لینا ہی کافی ہے یا آئندہ کے لیے گناہ کے ترک کرنے کا پختہ ارادہ کرنا بھی شرط ہے؟

۷۔ اس میں کیا راز ہے کہ مصیبت اسی صورت میں دور ہوتی ہے کہ آدمی تمام مخلوقات سے اپنی امید و بیم کا رشتہ بالکل منقطع کر لے اور اللہ کے سوا کسی سے امید وابستہ نہ رکھے؟

۸۔ مخلوقات سے تعلقات قطع کرنے اور کلیۃً خدائے واحد سے رشتہ جوڑنے کی کیا تدبیریں ہیں؟

ان سوالات کا جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ ان ساری باتوں کا جواب شرعِ متین کے مطابق بیان فرمائیں اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ سے پائیں۔

جواب شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ نے اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو امام ممدوح کے الفاظ میں پیش خدمت ہے۔ مطالعہ کریں اور اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کریں۔

پہلا باب

الحمد للہ رب العالمین

دعائے یونسؑ کی معنوی نسبت

دعا بمعنے عبادت اور سوال لفظِ دعا اور دعوت کا استعمال قرآن کریم میں دو[1] مختلف معانی میں ہوا ہے۔ ایک عبادت اور دوسرا سوال کے معنی میں۔ جن آیتوں میں دعا کا لفظ عبادت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

غیر اللہ کی عبادت کے رد میں فرمایا:

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۳)	(اے نبی!) آپ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں ورنہ آپ بھی عذاب پانے والوں سے ہو جائیں گے۔
وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○	جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پرستش کرتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کی جوابدہی اس کے پروردگار کے پاس ہوگی۔

[1] یہاں سے پہلے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے۔

(المومنون : ۱۱۷)	(اللہ کا فیصلہ ہے کہ) کافر نجات نہیں پاتے
وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○	(اے نبی!) آپ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ اس کی ذات کے سوا سب چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں۔ وہی بادشاہ ہے جس کے حضور تم کو حاضر ہونا ہے۔
(القصص : ۸۸)	

خدا کی عبادت کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے فرمایا:۔

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا[1] (الجن : ۱۹)	جب اللہ کا بندہ (نبی) اس کی عبادت کرنے کو کھڑا ہوتا تو وہ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے (انبوہ در انبوہ جمع ہوتے)

شیطان کی عبادت کرنے سے ڈرانے کی خاطر فرمایا:۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ○ (النساء : ۱۱۷)	(بیشتر لوگ) اللہ کے سوا بتوں کی پرستش کرتے ہیں (جن کو وہ عورتیں تصور کرتے ہیں) درحقیقت وہ شیطان مردود کی پوجا کرتے ہیں۔

سچی عبادت کی تلقین اس طرح فرمائی:۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ	اللہ ہی کی عبادت سچی عبادت ہے جو

[1] كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا کے معنی ہیں، وہ یکے بعد دیگرے صفیں باندھ کر کثرت اژدحام سے اس پر گرے پڑتے ہیں کہ قرآن سنیں یا عجیب چیز سمجھ کر جمع ہوتے اور بھیڑ کرتے۔ اس سے مراد جنوں کی جماعت ہے اور مومنوں کو ترغیب دلائی ہے۔ (مترجم)

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ (الرعد: ۱۴)

لوگ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ ان کی دعا کا جواب نہیں دیتے مگر شل اس آدمی کے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے کہ اس کے منہ میں پہنچنے والا نہیں ہے۔ کافروں کی عبادت برباد اور رائیگاں جاتی ہے۔

اور غیر اللہ کی عبادت نہ کرنے والوں کے بارہ میں فرمایا:۔

وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ

(الفرقان: ۶۸)

جو لوگ اللہ کے ہمراہ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو مارنے سے منع کیا گیا ہے اسے نہیں مارتے مگر سچائی کے ساتھ اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔

اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ

(الفرقان: ۷۷)

(اے نبی! کافروں سے) فرما دیجئے، میرے پروردگار کو تمہاری کیا پرواہ ہو اگر تم نے اس سے دعا و عبادت نہ کی۔

دعا اور صلوٰۃ کا تسمیہ | یہاں لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ایک بہت قوی جملہ ہے کیونکہ اس میں مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اگر مفعول کی طرف اضافت ہوتی تو بات اتنی زوردار نہ ہوتی۔ لہذا اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس کی عبادت کرو اور اسی سے سؤال کرو۔

اسی کے ساتھ فرمایا ہے:۔

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ○ (الفرقان: ۷۷)	تم نے چونکہ اس کی تکذیب کر دی ہے لہٰذا عنقریب اس کا عذاب لازم ہو جائے گا یعنی جھٹلانے والوں کے لیے عذاب لازمی ہے۔

لفظِ صلوٰۃ بھی اصل میں لفظِ دعا ہے اور اس کا نام صلوٰۃ اس بنا پر رکھا گیا کہ اس کے مفہوم میں دعا کے دونوں معنی شامل ہیں، عبادت کرنا اور سوال کرنا۔ لفظِ صلوٰۃ کی اس تفسیر کی فرمانِ الٰہی سے بھی تائید ہوتی ہے۔

قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن: ۶۰)	تمہارا پروردگار فرماتا ہے، تم مجھ سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں۔

دو وجہوں سے ایسا کہا گیا ہے ایک یہ کہ تم میری عبادت کرو اور دوسری یہ کہ میرے حکم کی تعمیل کرو۔ تم ایسا کروگے تو میں تمہاری بات کو شرفِ قبولیت بخشوں گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہے:۔

وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (شوریٰ: ۲۶)	اللہ ان لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے جو ایمان دار اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔

یعنی اِسْتَجَابَ لَهُمْ اللہ تعالیٰ انہیں مقبولیت سے مشرف فرمائے گا۔

تو گویا یہ بات واضح ہے کہ لغتِ عرب میں دعا کا لفظ بمعنی عبادت بھی استعمال ہوتا ہے اور بمعنی سوال وطلب بھی، جو محتاجِ ثبوت نہیں کیونکہ دعا کے معروف و متبادر معنی یہی ہیں، جیسا کہ استجابہٗ واستجاب لہ کے متعلق شاعر کہتا ہے ؎

وداع یا من یجیب الی الندیٰ
فلم یستجبہ عند ذاک مجیب

ترجمہ:۔ پکارنے والے نے کہا اے نداؤں کے سننے والے! وہ تجھ سے کیوں نہ مانگے جب تو قبول کرنے والا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے مانگو تو میں تم کو دے دوں گا۔ فرمایا:۔

سَلُوْنِیْ اُعْطِکُمْ | مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

یَنْزِلُ رَبُّنَا کُلَّ لَیْلَةٍ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ فَیَقُوْلُ مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبُ لَهٗ مَنْ یَّسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرُ لَهٗ	ہمارا پروردگار ہر ایک رات آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے جب کہ رات کا ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے پھر فرماتا ہے: کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کر لوں گا، کوئی ہے جو مجھ سے سوال کرے تو میں اس کا سوال پورا کر دوں۔ کوئی ہے جو مغفرت کا طلبگار ہو کہ میں اسے بخش دوں؟

سائل اور داعی اس حدیث میں بھی سب سے پہلے لفظِ دعا کا ذکر ہے اور اس کے بعد سوال اور استغفار کا ذکر ہے اور بخشش مانگنے والا بھی ایک سائل کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ ایک سوال کرنے والا بھی ایک داعی ہے، لیکن برائی دفع کرنے والے سائل کا ذکر، طالبِ خیر کے سوال کے ذکر کے بعد کیا ہے اور پھر ان دونوں کا اکٹھا ذکر لفظِ داعی کے بعد کر دیا ہے جو نہ صرف ان دونوں کے معنوں پر اطلاق رکھتا ہے بلکہ ان کے علاوہ اور معنوں پر بھی حاوی ہے۔ پس یہ ایک خاص بات کو عام سے معطوف کرنے کی قسم سے ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرۃ: ۱۸۶)	اے نبی! جب میرا بندہ آپ سے میری بابت سوال کرے تو (فرما دیجئے) میں نزدیک ہی ہوں۔ پکارنے والے کی دعا کو سن لیتا ہوں جب بھی وہ بلاتا ہے

عبادت اور سوال کا باہمی ربط عبادت اور سوال دعا کے دونوں معانی میں ایک قسم کا ربط پایا جاتا ہے، کیونکہ ہر ایک شخص جو کسی چیز کا سوال کرتا اور اس کا طلب گار ہوتا ہے اس میں رغبت اور خوف کی صفت[۱] پائی جاتی ہے۔ نیز جس سے سوال کرتا ہے اس کے آگے اپنے آپ کو ذلیل کرتا اور اس کے سامنے جھکتا ہے اور عبادت کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی کی عبادت کرتا ہے وہ اس سے حصول مطلب کا امیدوار ہو کر اس کی بارگاہ میں راغب ہوتا ہے اور اس کے جی میں ناکامی کا بھی خطرہ لگا رہتا ہے۔

عابد اور سائل الغرض ہر ایک عابد سائل ہے اور ہر ایک سائل عابد۔ اور عبادت اور سوال دونوں لازم ملزوم ہیں اور اسی لیے ہر ایک لفظ ان میں سے الگ الگ استعمال ہو تو وہ دونوں معانی کے لیے استعمال ہونے کا احتمال رکھتا ہے لیکن جب دونوں لفظ ایک ہی موقع پر استعمال ہوں تو سائل کے لفظ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے کسی نفع کے حاصل کرنے یا کسی نقصان سے بچنے کا خواہش مند ہے لیکن ایک عابد کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ حکم کی اطاعت کر کے اپنے مدعا کا خواہاں ہوتا ہے لیکن اس کے الفاظ میں صریح سوال اور الفاظ کی شکل میں درخواست نہیں ہوتی۔

---

[۱] کیونکہ وہ کامیابی کے حصول میں راغب اور اس کے عدم حصول سے خائف و ہراساں رہتا ہے

عبادت کا نصب العین

رغبت اور خوف جو لوگ خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے عبادت کرتے ہیں، وہ بھی رغبت اور رہبت اور خوف و رجا سے خالی نہیں۔ اپنی مراد کے پورا ہو جانے کی رغبت رکھتے ہیں اور اس کے فوت ہو جانے سے ہراساں رہتے ہیں۔ انبیائے کرام اخلاص کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز تھے، بایں ہمہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ان کی عبادت کے نصب العین کو رغبت اور خوف سے تعبیر فرماتا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ○	بیشک یہ پیغمبر نیکیوں کے بجالانے میں نہایت مستعدی سے کام لیتے تھے اور رغبت اور خوف کے محرک سے متاثر ہو کر وہ ہماری عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے اور ہماری ہی بارگاہ میں وہ عاجزی کرتے تھے۔
(الانبیاء: ۹۰)	

ایک دوسری جگہ پر مقربین بارگاہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○	(رات کو عبادت کرتے وقت) ان کے پہلو اپنے نرم بستروں سے جدا ہو جاتے ہیں اور وہ بیم و امید کے جذبات سے اپنے خدا کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق

------------------------------	عطا فرمایا ہے، اس سے (راہ خدا میں)
(الم سجدہ: ۱۶)	خرچ کرتے ہیں۔

خوف و رجاء بعض مشائخ طریقت سے منقول ہے کہ خوف و رجاء عوام کے مقامات سے ہے؛ اور اس طرح یہ تشریح کی گئی ہے کہ مقربین کے مدنظر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ کسی مخلوق چیز سے لذت حاصل کرنے کے خواہش مند نہیں ہوتے، لیکن وہ بہرحال کسی مدعا کے حصول کے خواہاں اور اس کے محروم رہ جانے کے اندیشہ سے لرزاں رہ جاتے ہیں۔ خواہ اِن کا مطمح نظر کتنا بلند اور مقصد کتنا اعلیٰ وارفع ہوتا ہے۔

دوزخ اور جنت بعض مشائخ سے یہ بھی منقول ہے کہ:-

"بارِ خدایا! میں نے جنت کے حصول کی خاطر یا دوزخ سے ڈر کر تیری عبادت نہیں کی۔"

اس قول کے قائل کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ جنت جسمانی حظوظ کا نام ہے اور دوزخ کا مفہوم ظاہری عذاب تک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم آخرت میں جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اپنے پیارے بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں وہ سب جنت کے مفہوم میں داخل ہیں اور دوزخ اس کی ضد ہے۔

اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن کا رتبہ سب سے بڑھ کر ہے، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتے اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگتے[1] جیسا کہ

---

[1] طریقہ نقشبندیہ کے ایک مشہور مقتدا امام ربانی علیہ الرحمۃ نے جو مجدد الف ثانی کے لقب سے معروف ہیں۔ اپنے مکتوبات میں بعینہ یہی تقریر لکھی ہے۔ یہ حوالہ دینے سے میرے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے عقیدت مندوں کو اولیاء اللہ کا منکر خیال کرتے ہیں وہ خود مشائخ طریقت کے کلام میں ان کا مضمون پڑھ لیں۔ دوسرے یہ کہ بعض اہلحدیث سب مشائخ کو ایک جیسا خیال کرتے ہیں، ان کو بھی یہ غلط فہمی دور ہو۔ (مترجم)

حدیث میں وارد ہے کہ آپؐ کے اصحاب نے دریافت کیا کہ آپ اپنی نماز میں کیا پڑھتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

إِنِّيْ أَسْئَلُ الْجَنَّةَ وَ أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ	میں جنت کا سوال کرتا ہوں اور دوزخ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ:۔

"ایسی آواز سے بات کرنا کہ سمجھ میں نہ آسکے، ایسی گھنگھناہٹ کو میں پسند نہیں کرتا"

جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے:۔

"انی لا احسن دندنتك الا دندنة معاذ فقال حولها ندندن"

دیدارِ خداوندی اور علمائے کرام | بعض علمائے کرام یہ کہنا قابلِ اعتراض خیال کرتے ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰى وَجْهِكَ	بارِ خدایا! میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھ کو اپنے دیدار کی لذت سے بہرہ ور فرما۔

ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے لذت حاصل کرنا کچھ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ لذت ہمیشہ کسی محسوس اور جسمانی چیز سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ان چیزوں سے بالاتر ہے۔

یہ خیال بھی بالکل باطل ہے اور ان لوگوں کو بھی پہلے فریق کی طرح جنت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے فریق کی طلب اور درخواست ٹھیک ہے۔ برخلاف اس کے موخر الذکر جماعت نے ایک جائز درخواست کا انکار کیا اور اس کو قابلِ اعتراض خیال کیا ہے۔

عزیمت کا اظہار

اکابرِ طریقت کا قول دوزخ کے عذاب سے درد محسوس کرنا حقیقت اور امرِ واقع ہے جس کی برداشت انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔

اور یہ جو بعض اکابرِ طریقت کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:

"اگر مجھ کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں بھی ڈال دے تو اس پر میں راضی ہونگا۔"

یہ ایک عزیمت کا اظہار ہے، لیکن بعض اوقات حقیقت کے رونما ہونے پر عزیمت قائم نہیں رہتی۔ جیسا کہ سمنون علیہ الرحمۃ ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا:

ولیس لی سواک حظ فکیف ما شئت فامتحنی	مجھ کو تیرے بغیر کسی چیز سے لطف حاصل نہیں ہوتا، اس لیے جس طرح بھی تو چاہے مجھے آزما لے۔

اس کے بعد وہ "عسر البول" کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے، تب ان کی آنکھیں کھلیں چنانچہ وہ مدرسوں اور مکتبوں میں جا کر معصوم بچوں سے دفعِ تکلیف کے لیے دعا کراتے پھرتے اور ان سے کہتے کہ:

"اپنے جھوٹے چچا کے لیے دعا کریں۔"

شہادتِ قرآنی کلامِ پاک میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ | بیشک تم موت سے ملاقاتی ہونے

الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ (آل عمران: ۱۴۳) سے پیشتر اس کے خواہاں تھے، لیکن اب تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

الغرض کسی چیز کا تصور باندھ کر کوئی ارادہ کر لینا اور بات ہے اور حقیقت کا ظہور میں آنا کچھ اور بات ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض اصحاب تصوف نے مقامات کے پوشیدہ نقائص پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"محبت و رضا اور خوف و رجاء عوام کے مقامات ہیں۔ واصل حقیقت جب دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی دنیا میں ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے تو اس کے دل سے اوہام نکل جاتے ہیں"

لیکن یہ قول سراسر غلط اور حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص جو زندہ ہے کسی مرغوب چیز کی محبت یا مبغوض چیز کی نفرت اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ انسان زندہ اور صاحب حواس ہو کر کائنات کے نیک و بد کو ایک جیسا محسوس کرتا ہے تو ایسا کہنے والا یا تو جاہل مطلق ہے کہ جو کچھ منہ سے کہتا ہے اس کی حقیقت کا تصور نہیں کر سکتا۔ یا مکار ہے اور حقائق کے وجود کا دانستہ انکار کرتا ہے۔

مقام فنا اور دعوائے محویت اگر فرض کر لیا جائے کہ بعض حالتوں میں انسان کی عقل زائل ہو جاتی ہے جس کو محویت اور فنا وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ایسے شخص کا بھی احساس بالکلیۃ زائل نہیں ہوتا۔ بلکہ موافق اور مخالف کے حُبّ و بُغض کا احساس فی الجملہ اس میں قائم رہتا ہے اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ توحید افعال اور توحید ربوبیت کا مشاہدہ کرانے والے جمع اور فنا کے مقام پر فائز ہو کر کسی موافق اور مخالف چیز کی بابت حُبّ اور بُغض یا رغبت اور نفرت کا بالکل احساس نہیں کرتے۔ دو مختلف چیز دل

میں فرق محسوس کرنا ناگزیر ہے اور اگر آدمی اس فرق کو محسوس نہ کرے جو شریعت نے بیان کیا ہے تو لامحالہ وہ طبعاً مختلف اشیاء اور مختلف امور میں فرق محسوس کرے گا اور اس حالت میں وہ اپنے مولیٰ کی مرضی کے تابع ہونے کی بجائے اپنی ہوائے نفس کا پیرو کار ہو گا۔

شیخ جنید بغدادیؒ یہی وجہ ہے کہ جب یہ فنا اور محویت کا مسئلہ شیخ جنید بغدادیؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے تصریح فرمائی کہ "توحیدِ افعال کا مشاہدہ کرتے ہوئے محظور اور مامور میں فرق کرنا اور جن باتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو ناپسند سمجھتا ہے ان میں امتیاز کرنا لازم ہے"۔ لیکن اگر کوئی شرعی فرق کو اڑا دے تو وہ یقیناً دائرہ اسلام سے خارج ہو گا اور بلحاظ شر بھی وہ عام کافروں سے بدتر ہو گا۔ کیونکہ یہی لوگ ہوتے ہیں جو انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے اشخاص میں تمیز نہیں کرتے بلکہ دونوں کو برابر سمجھنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ وحدتِ وجود کے قائل ہو کر خالق اور مخلوق کا فرق بھی اٹھا دیتے ہیں اور دونوں کو ایک سمجھتے ہیں۔

تاہم سب کا یہ انجام نہیں ہوتا بلکہ اکثر ان میں سے فی الجملہ فرق کو قائم رکھتے ہیں۔ اور اس لیے کبھی تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں اور کبھی نہیں۔ ان امور کی تفصیل کے لیے یہ جگہ نہیں۔

یہاں پر بتانا یہ تھا کہ دعا کا لفظ ہر دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس: ۱۰)	اور اہلِ جنت کی دعا کا خاتمہ یہ ہو گا کہ تمام تعریف اور ثناء اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے جو تمام عالموں کا پروردگار ہے

آیتِ کریمہ کی خاصیّت

ارشاداتِ نبویؐ ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ سب سے اچھا ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے (جس کو سائل نے اپنے سوال میں ذکر کیا ہے) کہ یہ میرے بھائی یونس علیہ السلام کی دعا ہے، یعنی:-

لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۶)	(اے پروردگار!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بیشک میں (اپنے حق میں) ظالم ہوں۔

اگر کوئی مصیبت زدہ ان الفاظ میں دعا کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور کر دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یونس علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے کلمات کو دعا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، کیوں کہ وہ دعا کے دونوں معانی پر مشتمل ہیں۔

اس کا پہلا حصہ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ توحیدِ الوہیت کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف دعا کے ہر دو معانی کو شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس سے قضائے حاجات کی بابت سوال کیا جائے [۱]

---

[۱] شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کلام میں یعنی اپنی تصنیفات میں اور نیز اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں مختلف جگہوں پر توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کا فرق نہایت شد و مد کے ساتھ (بقیہ بر صفحہ ۳۵)

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا کا دوسرا حصہ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اپنے گناہ اور قصور کا اقرار ہے جس کے ضمن میں طلب مغفرت کا سوال مضمر ہے، کیونکہ سائل کبھی تو اپنے سوال میں صریح طلب کا استعمال کرتا ہے جیسے اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ اور کبھی صرف اخبار کو سوال کا ذریعہ بناتا ہے۔

سوال کی مختلف صورتیں سوال کی پھر کئی صورتیں ہیں:

اوّل: یہ کہ اپنے حال کا اظہار کیا جائے۔

دوم: جس سے سوال کیا جائے اس کی کوئی مناسب حال صفت بیان کر دی جائے

سوم: بعض اوقات ان دونوں کا بیان ہوتا ہے۔

پہلی صورت کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا مندرجہ بالا قول ہے یا جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا	پروردگارا ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم

(بقیہ حاشیہ ۳۴) بیان فرمایا ہے ان کے کلام کا ملخص یہ ہے کہ توحید کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ تمام دنیا کا خالق و رازق ایک ہے اور وہ قادر مطلق ہے۔ اس کا نام توحید ربوبیت ہے اور مشرکوں کو بھی اس سے انکار نہیں، جیسے کہ قرآن مجید میں کثرت سے اس عقیدہ کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود سمجھے، اسی کے سامنے اپنا سر جھکائے، اسی سے قضائے حاجات کی بابت درخواست کرے۔ اسی کی ذاتِ پاک پر اس کا بھروسہ ہو اور اسی کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھے۔ اس کو توحیدِ الوہیت کہتے ہیں اور اسی توحید کی تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے تعلیم دی ہے۔ قرآن کریم نے بھی جابجا اسی توحید کی طرف لوگوں کو بلایا ہے اور بغیر اس کے آدمی مسلمان نہیں ہوتا۔ (مترجم)

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف: ۲۳)	نہ فرمایا تو ہم یقیناً نقصان اٹھانے والے زیاں کار ہو جائیں گے۔

ان ہر دو اقوال میں اپنی حالت کا بیان ہے اور ضمناً طلبِ مغفرت چاہی ہے اگرچہ بظاہر کوئی ایسا لفظ نہیں بولا محض ایک خبر بیان کی ہے کہ عدمِ مغفرت اور کرم نوازی سے شاد کام نہ فرمانا موجب خسران ہو گا۔

اسی قبیل سے حضرت نوح علیہ السلام کا اقبالِ جرم بھی ہے کہ انہوں نے کہا:

رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (ہود: ۴۷)	پروردگار! میں تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں نے تجھ سے ایک ایسی بات کا سوال کیا جس کا مجھے علم نہ تھا اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔

اس میں بھی بیانِ خبر طلبِ مغفرت کو شامل ہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○	پروردگار! میں اس نعمت کا محتاج ہوں جو تو میری طرف اتار دے۔

یہ ان کے حال کی ہو بہو تصویر ہے۔ نزولِ خیر اور برکتِ خداوندی کا محتاج ہونا ہی ایک سوال ہے جو رحمتِ الٰہی کو کھینچ کر لاتا ہے۔ امام ترمذی نے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ شَغَلَهٗ قِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ عَنْ ذِكْرِيْ وَمَسْاَلَتِيْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا	جس شخص کو تلاوتِ قرآن نے میری یاد اور سوال کرنے سے غافل کر دیا ہو۔ میں اسے تمام سائلوں سے بھی

أُعْطِي السَّائِلِيْنَ	زیادہ عنایت کر دیتا ہوں۔

دوسری صورت کی توضیح اس مثال سے ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنے گناہوں کا تصور کر کے کہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ	خدایا! بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

تیسری صورت کی مثال یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اَنَا الْمُذْنِبُ وَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ	خدایا! میں گناہگار ہوں اور تو بخشش و مغفرت کرنے والا ہے

حضرت سفیان سے سوال وجواب سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ عرفہ کے دن سب سے بہتر دعا یہ ہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یگانہ ہے کوئی اس کا شریک نہیں بادشاہی بھی اسی کی ہے اور حمد وثنا کا مستحق بھی وہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت سفیان نے پہلے تو یہ حدیث قدسی ذکر فرمائی کہ:

مَنْ شَغَلَهٗ ذِكْرِيْ عَنْ مَسْاَلَتِيْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِي السَّائِلِيْنَ	جس شخص کو میری یاد کی مشغولیت نے سوال کرنے سے غافل کر دیا ہو میں اس کو تمام سائلوں سے زیادہ بخش دیتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے امیہ بن ابو صلت کے ان اشعار کا حوالہ دیا جن میں اس نے

ابن جدعان کی مدح سرائی کی ہے:

ءاذکر حاجتی ام قد کفانی ... حبائك ان شیمتك الحیاء

اذا اثنی علیك المرء یوما ... کفاہ من تعرضه الثناء

ترجمہ: میں نہیں جانتا کہ میں اپنی حالت کا اظہار کروں یا تیری بخشش کا دریا خود بخود موجزن ہو گا۔ کیونکہ بخشش تیری فطرت میں داخل ہے۔

جب کبھی کوئی آدمی تیری مدح سرائی کرتا ہے تو پھر وہ طلب اور سوال کا محتاج نہیں رہتا۔

سفیان نے یہ شعر پڑھ کر فرمایا:

"تو یہ ایک آدمی ہے جو اپنے جیسے ایک آدمی کی تعریف کر رہا ہے اور خالق تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت ہی بالاتر ہے"

اور حضرت موسےٰ علیہ السلام کی یہ دعائے ماثورہ بھی اسی نوع میں شامل ہے:

اللھم لك الحمد والیك المشتکی وانت المستعان وبك المستغاث وعلیك التکلان	خدایا! تعریف و تحمید کا مستحق تو ہی ہے۔ تیری طرف میرا شکوہ ہے تو ہی میرا مددگار ہے تجھی سے میری فریاد ہے اور تجھی پر مجھے بھروسہ ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف جب انتہا تک پہنچ گئی تو انہوں نے رفع شدت کے لیے ان الفاظ میں دعا کی:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء: ۸۳)	بار خدایا! مجھ کو سخت تکلیف پہنچی ہے اور تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

یہ کنایۃً سوال کرنے کی تیسری صورت ہے۔ اس میں سائل نے اپنے حال

کا بھی اظہار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک مناسب حال صفت کے ساتھ تعریف بھی کی ہے جس کے ضمن میں اس بات کی درخواست ہے کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے اس کی تکلیف کو رفع فرما دے اور یہ ایک پیرایۂ بیانِ خبریہ ہے جس میں معنوی طور پر سوال اور طلب شامل ہے۔

پیرایۂ حسنِ ادب اس قسم کے سوال میں حسنِ ادب پایا جاتا ہے جیسا کہ کوئی شخص جو کسی کے ساتھ حسنِ ادب اور تواضع سے پیش آئے اور اسے کہے "میں بھوکا ہوں میں بیمار ہوں"۔ اس سے اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ مجھے کھانا کھلاؤ اور میرا علاج کرو۔

اسی طرح اگر الفاظ کے ذریعہ سے سوال کی طلبِ صادق اور سوال کی قطعیت کا تقاضا ہو گا تو ضروری ہے کہ سائل کے حالات اور اس کی پوزیشن کو واضح طور پر ظاہر کر کے بتلایا جائے کہ اس کا عجز و نکبت اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی حاجت براری کرنا چاہیئے اور یہ بات پوری توجہ سے کام لیے بغیر انجام نہیں پا سکتی اس لیے بفحوائے الکنایۃ ابلغ من التصریح[۱] وہ سوال اور درخواست کی ایک مؤکد ترین صورت ہے البتہ صریح سوال اور صیغہ طلب میں اپنے مقصد کا اظہار زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر دعاؤں میں یہی صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔

جامع ترین دُعا اس لیے اگر کوئی دعا سائل اور مسئول دونوں کا حال بیان کر دینے پر مشتمل ہو گی، تو وہ دعا کی جامع ترین صورت ہو گی کیونکہ ایسی دعا سائل کے حال کی اطلاع اور مسئول کے حال کے علم کی حامل ہوتی ہے جو دعا کی قبولیت کی ضامن ہوتی ہے جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھ کو کسی ایسی

---

[۱] یہ علم بیان کا ایک اصول ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی بات کو صریح نہ کہنا بلکہ کنایہ کے ساتھ کہنا بمقابلہ صریح اظہارِ مقصد کے بلیغ تر اور زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔" (مترجم)

دعاء کی تعلیم دیجیے جس کو میں اپنی نماز میں پڑھا کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ دعا سکھائی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ	بار خدایا! میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تو ہی گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاں سے مجھ کو مغفرت عنایت فرما اور مجھ پہ رحم کر بیشک تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اس میں سائل اپنے حال کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مغفرت کا محتاج ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی اس کی مطلب براری پر قادر نہیں۔ اس کے بعد صریحاً اپنے مقصد کے متعلق درخواست ہے، اپنے رب کو مغفرت اور رحمت کی صفات سے موصوف ظاہر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اوصاف درخواستِ مذکور کو شرفِ قبولیت بخشنے کے مقتضی ہیں۔ اس قسم کی دعا جامع ترین دعا سمجھی جاتی ہے۔

قرآنی دعاؤں کا خاصہ الغرض دعا کی یہ تمام قسمیں استعمال میں آتی ہیں اور قرآن کریم میں جو دعائیں مذکور ہیں وہ تمام اقسام کی حامل ہیں: مثلاً موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○ (القصص: ۲۴)	اے میرے رب! جو کچھ نعمت بھی تو میری طرف نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

اس میں اپنے حال کا اظہار کیا ہے، دوسری جگہ آپ کا یہ قول منقول ہے:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ	اے میرے رب! میں نے اپنے

فَاغْفِرْ لِيْ (القصص ۱۶) | آپ پر ظلم کیا ہے پس تو مجھے بخش دے

اس میں اپنا حال ظاہر کرنے کے علاوہ طلب مغفرت کی تصریح ہے۔

تیسری دعا، حضرت موسے علیہ السلام کی سورۂ اعراف میں، ان کی زبان سے نقل کی گئی ہے،

أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ	تو ہی ہمارا سرپرست اور کارساز ہے
ارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ	ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما
الْغَافِرِيْنَ ○	تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔

اس میں مسئول کا حال بیان کیا گیا ہے جو اجابت کا مقتضی ہے۔ اور ساتھ ہی طلب کی بھی تصریح ہے۔

بہر حال سوال کی یہ تمام تر قسمیں مستعمل ہیں اور ہر ایک قسم کی ایک خاص خصوصیت ہے ——————

دوسرا باب

درجہ پذیرائی دُعائے یونس علیہ السلام

دُعا کا مخصوص انداز اب رہا یہ سوال کہ حضرت یونس علیہ السلام نے کیوں اپنی دعا میں مقصد کی تصریح نہیں کی ؟ اور صرف اپنا حال بیان کرنے پر کیوں اکتفا کیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مناسب یہی تھا کہ اپنے حال کا اظہار کرنے پر اکتفا کیا جاتا کیونکہ کلام بلیغ وہی ہوتا ہے جو اقتضائے حال کے مطابق ہو۔

یہاں پر مقام کا اقتضا ر گناہ کا اعتراف اور اس بات کا اظہار ہے کہ جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی ہے، اس کا موجب میرا اپنا گناہ ہے۔ سببِ مغفرت ضمناً مطلوب ہے اس لیے لفظِ سوال سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

رفعِ تکلیف کا حقیقی ذریعہ حضرت یونس علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ خطا کار اور ستم گار ہیں اور اس تمام مصیبت کی علتِ حقیقی ان کا اپنا گناہ اور تقصیر ہے۔ اس لیے ظلم اور گناہ کا اعتراف کرنا اور اس پر ندامت کا اظہار کرنا ہی رفع سبب کا موجب ہوگا جو زوالِ مصیبت اور رفع تکلیف کا حقیقی علاج ہے۔ اس کی مزید توضیح لفظ سُبْحَانَكَ کی تشریح ہو سکتی ہے۔

عظمتِ الٰہی کا اعتراف سُبْحٰنَكَ میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ (ہر ایک عیب اور نقص سے پاک اور مبرا ہونا) اور اس کی عظمت کا اعتراف ہے بلحاظ مقام کے اس کی تنزیہہ کا یہ مفہوم ہے کہ اس کی ذاتِ پاک اس سے منزہ اور برتر ہے کہ کسی پر ظلم کرے یا بغیر

کسی گناہ اور قصور کے کسی پر عقوبت اور عذاب نازل فرمائے۔ غالباً اس بات پر زور دیتا ہو کہ خدایا تو پاک اور بے عیب ہے اس بات سے کہ بغیر کسی جرم اور قصور کے مجھ پر ظلم کرے اور عذاب میں مبتلا کرے، بلکہ میں خود ہی ظالم تھا جس نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے:

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ [1]	خدا نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے۔
وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ [2]	خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ تو خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے ہیں۔
وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ [3]	خدا نے ان پر کچھ بھی ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ظالم تھے۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ [4]	بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام بھی اپنی دعا میں اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں:۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف: ۲۳)	بار خدایا! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہم پر مغفرت اور رحمت نہ کی تو ہم زیاں کاروں میں سے ہو جائیں گے۔

استفتاح نماز کی دعا ۔ صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتاح (آغاز نماز) کی دعا ان الفاظ میں منقول ہے:۔

---

[1] النحل: ۱۱۸ [2] ہود: ۱۰۱ [3] زخرف: ۷۶ [4] یونس: ۴۴

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَنْتَ رَبِّيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ -------	الٰہی! تو ہی شہنشاہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو ہی میرا پروردگار ہے اور میں تیرا غلام ہوں، میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں پس تو میرے تمام گناہ بخش دے۔ بیشک تیرے سوا گناہ بخشنے والا کوئی نہیں ہے۔

سید الاستغفار کی فضیلت صحیح بخاری میں سید الاستغفار کی یہ عبارت آئی ہے کہ آدمی یوں کہے:۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ وَ اَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ ------- ------- -------	بارخدایا! تو میرا رب ہے۔ سوائے تیرے اور کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں تیرے عہد و پیمان اور وعدے پر قائم رہا ہوں، جو برائیاں میں نے کیں ان کے شر سے تجھی سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں اپنے اوپر تیری نعمتوں کا اعتراف کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا بھی مجھے اقرار ہے تلے خدا تو مجھے بخش دے، بیشک تیرے سوا اور کوئی نہیں جو گناہوں کا بخشنے والا ہو

اس کی بابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ:۔

"جس شخص نے صبح کے وقت اس کو پڑھا، بشرطیکہ اسے ان الفاظ پر یقین ہو اور پھر وہ اسی دن مر جائے تو وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس شخص نے اس کو شام کے وقت پڑھا بشرطیکہ اس کو ان الفاظ پر یقین ہو اور پھر وہ اس رات میں مر جائے تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

عدل اور احسانِ خداوندی کا اعتراف الغرض آدمی کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے عدل اور احسان کا اعتراف کرے کیونکہ وہ کسی پر بھی ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا اور کسی کو بغیر اس کے اپنے کیے ہوئے جرم کی سزا نہیں دیتا۔ اس کے احسانات اور بندہ نوازیوں کا سلسلہ غیر منقطع ہے اس کی طرف سے جو عقوبت اور عذاب نازل ہو وہ عین عدل ہے اور اگر وہ کسی کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمائے تو یہ اس کا احسان اور فضل ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ کا مفہوم

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ کے یہ معنی ہیں کہ خدائے تعالیٰ اپنی الوہیت کے اوصاف میں یکتا ہے اس کا علم ہر ایک چیز پر محیط ہے اس کی قدرت ہر ایک بات کو شامل ہے اس کی رحمت بے پایاں ہے اور اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے اس کی الوہیت کے اعتراف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے بندوں پر متواتر اپنے احسانات نازل فرماتا ہے کیونکہ اس کی الوہیت کے یہ معنی ہیں کہ وہ عبادت کا مستحق ہے جس کا بالفاظِ دیگر یہ مفہوم ہے کہ وہ ان تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ موصوف ہے جن کی وجہ سے وہ اپنے بندوں کے لیے انتہا درجہ کا محبوب ہے اور ان کے دلوں میں اس کی بے حد عظمت ہے اور وہ اس کے سامنے بے انتہا خضوع کرتے ہیں عبادت کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ انتہا درجے کی محبت اور انتہا درجے

کا خضوع۔

لفظِ سُبْحَانَکَ کا مفہوم

سُبْحَانَکَ کے یہ معنی ہیں کہ وہ ظلم اور دیگر نقائص وعیوب سے پاک اور منزہ ہونے کے علاوہ جلالت اور عظمت کا مستحق ہے، کیونکہ اگر تسبیح کا سادہ مفہوم اس (ذاتِ پاک) کا نقائص اور عیوب سے مبرا ہونا ہے جیسا کہ مرسل حدیثوں میں موسیٰ بن طلحہ کی ایک حدیث میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فِیْ قَوْلِ الْعَبْدِ سُبْحَانَ اللّٰہِ اَنَّھَا بَرَاءَۃُ اللّٰہِ مِنَ السُّوْءِ	آدمی کے سبحان اللہ کہنے کا مفہوم ہر برائی سے اللہ تعالیٰ کی برارت کا اظہار ہے۔

لیکن فقط نفی، کبھی مدح نہیں تصور کی جاتی ہے، جب تک اس کے ضمن میں کمال کا اثبات نہ ہو اس لیے ہم کہتے ہیں کہ تسبیح کے مفہوم میں اس کی عظمت اور جلال کا مفہوم بھی شامل ہے۔ قرآن کریم میں عموماً جہاں کہیں اللہ تعالیٰ سے کسی عیب اور نقص کی نفی کی گئی ہے، ساتھ ہی اس کی صفاتِ کاملہ اور اس کے اسماءِ حسنٰے کا بھی ذکر ہے، مثلاً ارشاد ہے:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ------------ (البقرہ: ۲۵۵)	اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں وہی زندہ اور تمام کائنات کو قائم رکھنے والا ہے اسے نہ کبھی اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

گویا اونگھ اور نیند کی نفی اس کی حیات اور قیومیت کے کمال کا موجب ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ	بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین کو

الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا فِيْ — اور ان کی درمیانی مخلوقات کو چھ دن
سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ — میں پیدا کیا اور ہمیں کچھ بھی تکان
لُّغُوْبٍ ○ (قٓ: ۳۰) — محسوس نہ ہوئی۔

پس معلوم ہوا کہ تکان کا محسوس نہ ہونا اس کے کمال قدرت کی دلیل ہے۔

صدورِ ظلم کا عدمِ امکان الغرض حضرت یونس علیہ السلام کے قول "سُبْحَانَكَ" میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کی عظمت کا اثبات ہے جو نفیِ ظلم کے لیے بمنزلہ دلیل کے ہے کیونکہ جو شخص ظلم کرتا ہے یا تو وہ اس کا محتاج ہوتا ہے یعنی اس کا مقصد بغیر ظلم کے پورا نہیں ہوتا اور یا اس کا باعث اس کی جہالت ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ غنی و بے نیاز ہے اور اس کا علم ہر ایک چیز پر محیط ہے اس لیے اس سے ظلم کا صادر ہونا ممکن نہیں۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ — اور یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالےٰ
(العنکبوت: ۴۰) — کسی پر ظلم کرے۔

دعائے یونس علیہ السلام کی فضیلت

افضل الکلام حضرت یونس علیہ السلام کی اس دعا کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اس میں تسبیح وتہلیل کو جمع کیا گیا ہے اور حدیث صحیح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ قرآنِ کریم کے بعد بہترین یہ چار کلمات ہیں :۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ

لیکن تم جانتے ہو کہ تسبیح کے ساتھ تحمید گویا لازم ہے۔ اسی طرح تہلیل اور تکبیر کا ساتھ ہے نیز ایک صحیح روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل کلام کی بابت دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الْكَلَامِ مَا اصْطَفَى اللّٰهُ لِمَلٰٓئِكَتِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ	افضل کلام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے پسند فرمایا ہے یعنی وہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ ہے۔

صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ:

كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِى الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ	دو ایسے کلمے ہیں جو زبان پر نہایت ہلکے (آسان) ہیں مگر قیامت کو ترازو میں بہت وزنی ہوں گے اور وہ دونوں اللہ تعالیٰ کو بہت پیارے ہیں (وہ یہ ہیں) سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

ان دونوں کلمات میں خدا کی تسبیح کو اس کی حمد اور اس کی عظمت کے ساتھ ملایا گیا ہے

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تسبیح کے مفہوم میں نقائص اور عیوب کی نفی کے علاوہ عظمت و جلال اور صفاتِ کمال کا بھی اثبات ہے۔

قرآنِ کریم میں ایک جگہ حکم دیا گیا ہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	اپنے پروردگار کی حمد بیان کرو۔

فرشتوں نے جواب دیا تھا:

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ: ۳۰)	خدایا! ہم تیری حمد و تقدیس کے گیت گاتے ہیں۔

محامدِ ذات کی محبوبیت گویا جس طرح خدا کی حمد و تعظیم کو یہاں یکجا بیان کیا ہے۔ اسی طرح بعض دوسری جگہوں میں اجلال و اکرام کی صفت کو جمع کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ عظمت اور کبریائی کے ساتھ موصوف ہونے کے باوجود اپنے محامدِ صفات کی وجہ سے اپنے بندوں کو نہایت ہی محبوب ہے۔ ذوالجلال والاکرام کے یہی معنی ہیں اور عبادت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ معبود کی عظمت اس کی محبت کے ساتھ ملی جلی ہوئی ہے جیسے کہ ہم پہلے اس کی توضیح کر چکے ہیں۔

امام رازیؒ کا نظریہ امام فخرالدین رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ "جلال صفتِ سلبیہ ہے اور اکرام صفتِ ثبوتیہ" لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ تحقیقی بات وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ یہ دونوں صفاتِ ثبوتیہ ہیں اور صفاتِ کمال کا اثبات بھی نفیِ نقائص کا موجب ہے جیساکہ اس کی تنزیہ صفاتِ کمال کے اثبات کے مترادف ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مفہوم میں نقائص اور عیوب کی نفی بھی پائی جاتی ہے اس لیے کہ وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور وہی عظمت و تعظیم کے لائق ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لہ النحل: ۹۹

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (لقمان: ۲۶)	بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بے پرواہ اور ستودہ صفات ہے۔

اور سلیمان علیہ السلام کا قول:-

فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (النمل: ۴۰)	بیشک میرا پروردگار ہی بے پرواہ اور کریم ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (التغابن: ۱)	اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تعریف ہے۔

کیونکہ بکثرت صاحب کمال وعظمت ایسے ہوتے ہیں جو حمد کے لائق نہیں ہوتے، بلکہ قابلِ مذمت ہوتے ہیں اور بکثرت محبوب ایسے ہوتے ہیں جنہیں اس لحاظ سے کوئی عظمت نصیب نہیں ہوتی، بلکہ نہایت عاجز، ذلیل اور ضعیف ترین انسان شمار کیے جاتے ہیں، اول الذکر سے محبت نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے رعب داب سے ڈرا جاتا ہے جو لائق محبت نہیں۔

عظمت وکبریائی کا اظہار کمال محبت اس وقت حاصل ہوتا ہے جب یہ دونوں اوصاف جمع ہو جائیں جیسا کہ آثار صحابہؓ میں ہے:

إِنَّ الْمُؤْمِنَ رُزِقَ حَلَاوَةً وَمَهَابَةً	مومن وہ ہے جو خدا کے ڈر اور حلاوت ایمان سے شاد کام ہو۔

نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں فرمایا:

مَنْ رَآهُ بَدِيْهَةً هَابَهُ وَمَنْ خَالَطَهُ مَعْرِفَةً أَحَبَّهُ -------	جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر طور پر دیکھا وہ مرعوب ہو گیا اور جس نے آپؐ سے میل جول کیا، اس نے محبوب جانا

اسی وجہ سے تسبیح کو تحمید کے ساتھ اور تہلیل کو تکبیر کے ساتھ وابستہ کر دیا، جیسے اذان کے الفاظ میں خدا کی کبریائی بیان کرنے کے بعد اس کی الوہیت کا اعلان ہے۔

اور پھر ان ہر دو کلمات کی بھی دو قسمیں ہیں، جب اکیلے استعمال ہوتے ہیں تو دوسرے کے مفہوم کو بھی ضمناً شامل ہوتے ہیں کیونکہ یہ دونوں کلمے عظمتِ الٰہی کو ظاہر کرتے اور تحمید الٰہی کا اثبات کرتے ہیں اور یہی بات لازمۂ الوہیتِ الٰہی ہے۔ کیونکہ عبادت اسی کی کی جاتی ہے جس سے بدرجۂ کمال محبت ہو۔ اسی طرح اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مفتاح الخطاب ہے اور سُبْحَانَ اللّٰہِ عظمتِ الٰہی کا ثبوت ہے اسی لیے فرمایا:

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (الواقعہ: آخر)	اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی تسبیح بیان کیا کر۔

الغرض اللہ تعالیٰ باوجود انتہا درجہ کی عظمت و کبریائی کے بدرجۂ غایت محبوب ہے اور اس لیے وہی عبادت کا مستحق ہے کیونکہ دوسروں میں یہ دونوں اوصاف ساتھ ساتھ بدرجۂ اتم نہیں پائے جاتے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ انہی اوصاف کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

اسی طرح کلماتِ اربعہ میں سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں اللہ تعالیٰ کے لیے تمام محامد اور محاسن کا اثبات ہے کیونکہ اس کی الوہیت تمام محامد صفات کی مقتضی ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ میں اس کی عظمت کا اظہار ہے۔ عظمت و کبریائی دونوں کے معنی بڑائی کے ہیں، لیکن کبریائی کا مفہوم نسبتاً کامل تر ہے اور اس لیے نماز اور اذان و اقامت کے الفاظ مشروعہ اور دیگر ادعیہ ماثورہ میں جابجا اللہ تعالیٰ کو کبریائی کے ساتھ موصوف ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک صحیح روایت سے یہ حدیث قدسی منقول ہے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہبند ہے جو کوئی ان صفات میں میرے ساتھ جھگڑا کرے گا، (یعنی اپنے

آپ کو ان صفات سے موصوف ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا، میں
اس کو عذاب دوں گا۔"

اور ایک روایت میں ہے کہ:

"میں اس کو توڑ ڈالوں گا۔"

ظاہر ہے کہ عرب کے نزدیک چادر کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ لہذا عبارت مذکور میں کبریائی کو چادر سے تعبیر کرنا ایک پیرایۂ بیان ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبریائی کے مفہوم میں بڑائی کا مفہوم بہت زیادہ ہے۔

اسمائے حُسنٰے اور کلماتِ چہارگانہ ان کلمات چہارگانہ میں سے جب ہر ایک کلمہ الگ استعمال ہو تو وہ دوسرے کلمات کے مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے اور اگر دوسرے کلمات کے ساتھ مقرون ہو کر استعمال ہو تو پھر ہر ایک کلمہ اپنے خاص مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اسماءِ حسنٰے میں سے ہر ایک اسم دوسرے اسمار کے مفہوم پر ضمناً مشتمل ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک اسم میں ذات کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس کی ذات تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے لیکن اگر ساتھ ساتھ دو یا تین یا زیادہ اسمائے حسنٰے مذکور ہوں تو ہر ایک اسم اپنا خاص مفہوم ظاہر کرتا ہے۔

مدحت طرازی بدرجہ غایت اس بنا پر حضرت یونس علیہ السلام کا یہ قول کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ کلمات چہارگانہ کے معانی پر مشتمل ہے جن کو قرآن کریم کے بعد دوسرے درجہ پر افضل الکلام بتایا گیا ہے اور اس کے ضمن میں تمام اسمائے حسنٰے اور صفاتِ عُلیا کا مفہوم شامل ہے۔ اس لیے یہ غایت درجہ کی مدح ہے۔

اظہارِ حال واعترافِ قصور اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں اپنے حال کا اظہار اور گناہ اور قصور کا مؤکد اعتراف ہے۔ یہ ایک ایسا اعتراف ہے جو ہر ایک فردِ بشر کے لیے ناگزیر ہے خصوصاً جبکہ وہ اپنے پروردگار کے ساتھ مناجات میں مشغول ہو

بروایت صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ:

لَا یَنْبَغِیْ لِعَبْدٍ اَنْ یَّقُوْلَ اَنَا خَیْرٌ مِنْ یُوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی	کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں کہ میں یونس بن متی سے اچھا ہوں۔
مَنْ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِنْ یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی فَقَدْ کَذَبَ	جو شخص یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے اچھا ہوں وہ اپنے اس قول میں جھوٹا ہے۔

ایک دلچسپ توجیہ اس حدیث شریف کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتا ہے کہ وہ یونس علیہ السلام کی طرح صریح اور صاف لفظوں میں اپنے گناہ کا اعتراف کرے، بیشک وہ جھوٹا ہے اس لیے بزرگان دین میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو اس مقام سے بری قرار نہیں دیا، بلکہ وہی کہتے رہے جو ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا، ان کے پیشوا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تیسرا باب

حکمت وخاصیت کتاب وسنت کی روشنی میں

دعائے یونس علیہ السلام

سبب اور ازالہ مصیبت اب رہا سائل کا یہ قول[1] کہ اس سے مصیبت دور ہونے میں کونسی حکمت ہے؟ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ اس میں کونسی حکمت ہے مصیبت کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی دور نہیں کرسکتا۔ کلام پاک میں ہے:

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ	اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے
فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ	تو سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں،
يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ	جو اسے دور کرسکے اور اگر وہ تم کو بھلائی
لِفَضْلِهِ	پہنچانا چاہے تو کوئی بھی اس کے فضل
(یونس: ۱۰۷)	کو روکنے والا نہیں۔

یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر ایک تکلیف اور مصیبت کا حقیقی سبب انسان کے اپنے گناہ ہوتے ہیں۔ فرمایا:

[1] یہاں سے سوال نمبر ۲ کا جواب شروع ہوتا ہے (ناشر)

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ (شوریٰ: ۳۰)	تم کو جو کچھ بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کیے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور اللہ تو بہت سے گناہ بخش بھی دیتا ہے (اور ان پر مواخذہ نہیں کرتا)

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنا ازالۂ سبب کا حکم رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝	یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ ان میں موجود ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ان کو بخشش طلب کرنے پر عذاب میں مبتلا کر دیا جائے

پس اس بات سے خبردار ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ اپنے گناہوں سے بخشش مانگنے والے کو عذاب نہیں کرے گا۔

ہر تنگی اور اندیشے سے نجات

حدیث شریف میں ہے کہ:

مَنْ اَكْثَرَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ فِيْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَمِنْ كُلِّ ضِيْقٍ مَخْرَجًا وَرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ----------------- -----------------	جو شخص کثرت سے اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ہر اندیشے سے نجات بخشتا ہے اور ہر ایک تنگی سے نکلنے کا اس کے لیئے راستہ بنا دیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قول میں کہاں تک ان اصول

کی پابندی اور ان پر عمل کیا گیا ہے؟

خیر و برکت کا سرچشمہ | لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ میں توحید الوہیت کا اقرار اور اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں اپنے گناہ اور قصور کا اعتراف ہے جس کے ضمن میں طلب مغفرت پائی جاتی ہے اور تم جانتے ہو کہ تمام خیر و برکت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کی مشیت ہے جو چاہے سو کرے اور جس چیز کو وہ نہ چاہے اس کا ہونا محال اور ناممکن ہے لیکن اس خیر و برکت کے نزول سے آدمی کے اپنے گناہ مانع ہوتے ہیں اس لیے توحید الوہیت کی شہادت انسان کے لیے خیر کا دروازہ کھول دیتی ہے اور استغفار سے شر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے اپنی امید و بیم کو وابستہ رکھے اور اس بات کا خوف کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر ظلم کرے گا ـــــ (العیاذ باللہ) ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ ـــــ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ	بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ خود اپنے آپ ظلم کرتے ہیں۔

بلکہ اسے اس بات سے ڈرنا چاہیئے کہ اس کے اپنے گناہ اس کے لیے عذاب کا موجب نہ بن جائیں۔

حضرت علیؓ کا قول | حضرت علیؓ کا قول ہے کہ

لَا يَرْجُوَنَّ عَبْدٌ اِلَّا رَبَّهٗ وَلَا يَخَافَنَّ اِلَّا ذَنْبَهٗ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ	انسان کو صرف اپنے خدا ہی سے امید و بیم کی لو لگانا چاہیئے اور فقط اپنے گناہوں سے اسے ڈرنا چاہیئے۔

امید و بیم کا ملجا و ماویٰ | ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک بیمار کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا:

كَيْفَ تَجِدُكَ ؟ | تم اپنے کو کس حالت میں پاتے ہو ؟

اس نے جواب میں عرض کیا کہ :-

اَرْجُو اللّٰہَ رَحْمَتَہٗ وَاَخَافُ ذُنُوْبِیْ	اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امید وار ہوں، اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں ۔

آپؐ نے فرمایا :

مَا اجْتَمَعَا فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ مِثْلَ ھٰذَا الْمَوْطِنِ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ مَا یَرْجُوْا وَ اٰمَنَہٗ مِمَّا یَخَافُ	ایسے موقعے پر جس مومن کے دل میں خوف و رجاء جمع ہوں یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی امید بر لائے گا اور جس چیز سے وہ ڈرتا ہے اس سے اس کو بے غم کر دیگا۔

بہرحال انسان کی امید صرف اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہونی چاہیئے کسی دوسری مخلوق کے ساتھ نہ ہو حتیٰ کہ اپنی قوت اور اپنے عمل کے ساتھ بھی اپنی امیدوں کو وابستہ نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا شرک ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی پسند نہیں فرماتا :

موجب اثراتِ اسباب | اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے حصول کے لیے اسباب مقرر فرمائے ہیں لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسباب بذاتِ خود کچھ بھی مؤثر نہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے اثر کو باطل فرما دے۔ فرمایا :

یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ (الرعد: ۳۹)	اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔

اسبابِ عدمِ ظہورِ نتائج | نیز بعض یا اکثر اوقات موانع اور عوارض کی وجہ سے اسباب کے عمل میں لائے جانے کے باوجود مطلوبہ نتائج ظہور میں نہیں آتے اور ان عوارض اور عوائق و موانع کا دور کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اسی بنا پر کسی بندگ نے کہا ہے کہ :-

اسباب پر نظر رکھنا شرک ہے لیکن اسباب سے بالکل قطع نظر کر لینا اور ان پر مطلق التفات نہ کرنا بھی عقل اور شرع کے خلاف ہے۔"

کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ○ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ○ (انشراح: ۸،۷)	جب تم دوسرے مشاغل سے فارغ ہو جایا کرو تو تکلیف برداشت کرو اور صرف اپنے پروردگار کی طرف راغب ہوا کرو۔

اس آیت میں اس بات کا حکم ہے کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رغبت رکھنا چاہیے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ (المائدہ: ۲۳)	تم اگر مومن ہو تو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔

کامرانی کی حقیقی شاہراہ

توکّل علی اللہ اور شرک انسان کا بھروسہ ہمیشہ اس چیز پر ہوتا ہے جس سے اس کی امیدیں وابستہ ہوں۔ اس لیے جس شخص کی امیدیں اپنے زورِ بازو، اپنے علم و عمل، اپنے حال یا اپنے دوست، اپنی قرابت یا اپنے مال و دولت، اپنے پیر و استاد یا بادشاہ کے ساتھ وابستہ ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو تو سمجھ لو کہ وہ ان چیزوں پر بھروسہ رکھتا ہے اور اس کا توکل ان چیزوں پر ہے لیکن یہ شرک ہے۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج:)	جو شخص اللہ سے شرک کرتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ آسمان سے گر کر مر گیا اور پرندے اس کا گوشت نوچتے ہیں یا ہوا اسے دور دراز مقام پر اڑا کر لے جائے۔

مخلوق پر بھروسہ جو شخص کسی مخلوق سے اپنی امیدوں کو وابستہ کرتا ہے، یا حصولِ مقصد کے لیے اس پر بھروسہ رکھتا ہے اس کا انجام ناکامی ہوگا اور جلد یا بدیر اس کی یہ غلط فہمی دور ہو کر رہے گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ	بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اس کا شریک بنا لیتے اور ان سے خدا کی طرح محبت رکھتے ہیں۔ لیکن

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ○ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ○ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ○

(البقرہ: ۱۶۵ تا ۱۶۷)

جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت زیادہ سرشار ہیں اور اگر یہ ظالم لوگ اس حالت کو دیکھ لیں جبکہ عذاب ان کو سامنے نظر آجائے گا تو انہیں اور زیادہ یقین ہو جائے گا کہ تمام تر طاقت اللہ کے لیے مخصوص ہے اور بے شک اللہ کا عذاب نہایت سخت ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ پیشوا اپنے مریدوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور جن اسباب پر ان کو بھروسہ تھا وہ سب منقطع ہو جائیں گے۔ پیروی کرنے والے مرید کہیں گے، کاش اگر ہمارے لیے دنیا میں دوبارہ لوٹ جانا میسر آجائے تو ہم بھی ان پیشواؤں سے اسی طرح بیزار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے بیزار ہوئے، اس طرح اللہ ان کے اعمالِ بد انہیں دکھاتا ہے کہ ان پر حسرت طاری ہو، بہر حال انہیں دوزخ کی آگ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا۔

اور فرمایا:-

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ○ (بنی اسرائیل : ۵۶، ۵۷)	(اے نبی! مشرکوں سے) فرما دیجیے، اللہ کے سوا جن کو تم خدا سمجھتے ہو ان کو بلاؤ۔ وہ تم سے مصیبت دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی بدلہ دے سکتے ہیں، وہ تو خود بھی اپنے پروردگار کو بلاتے اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون اس سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف رہتے ہیں بلاشبہ تیرے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔

مشرک مرعوب اور مومن مامون یہ مشرکوں کی ایک خاص صفت ہے کہ ان کا ڈرنا اور ان کی امید و بیم مخلوق سے وابستہ ہوتی ہے اور اس سبب سے وہ ہمیشہ مرعوب رہتے ہیں۔ کلام پاک میں ہے:

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ (آل عمران : ۱۵۱)	ہم ان کافروں کے دلوں میں اس لیے رعب ڈال دیں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا دیا۔

اس کے برخلاف جس کی توحید خالص ہے وہ امن میں رہتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کا جامہ نہیں پہنایا، ان کے

لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (المائدہ : ۸۲)	لیے امن وامان ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ۔

اس آیت میں لفظ "ظلم" کی تفسیر "شرک" کے ساتھ کی ہے۔ نیز ایک صحیح اور مرفوع حدیث میں منقول ہے جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ متردد ہوئے کہ کون ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا ۔ تو آپ نے فرمایا :

اِنَّ هٰذِهِ الشِّرْكُ	یعنی اس سے مراد شرک ہے ۔

اور اس کی تائید میں آپؐ نے قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی اور فرمایا کیا تم نے یہ نہیں سنا۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان : ۳۲)	شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے ۔

اس نقطہ کو ملحوظ خاطر رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ اسباب کا ذکر فرماتے ہوئے اس بات کی تصریح فرماتا ہے کہ ان مشرکوں پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ ایک ایمان دار کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ اس کا تمام تر بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔

جنگِ بدر اور اسبابِ فتح مندی

جنگِ بدر میں ملائکہ کے نزول کا ذکر فرماتے ہوئے کلامِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے :

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (آل عمران : ۱۲۶)	ملائکہ کا نزول فقط تم کو خوش کرنے کے لیے تھا اور یہ کہ تمہارے دل تسلی پذیر ہو جائیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فتح مندی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے جو غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ	بے شک اللہ تعالیٰ نے تم کو بہت

مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (التوبہ: ۲۶)	سے میدان ہائے جنگ میں فتح مندی عنایت کی، اور جنگِ حنین کے موقع پر بھی تم کو فتح مند کیا جب کہ تم اپنی کثرت پر نازاں سقے لیکن تمہاری کثرت تمہارے ذرہ بھی کام نہ آئی اور زمین نے باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی، اور بالآخر تم بھاگ نکلے، ازاں بعد (جبکہ تم پر اسبابِ ظاہری کی حقیقت روشن ہو گئی) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنوں پر تسلی نازل فرمائی اور ایسے لشکر ان کی مدد کے لیے بھیجے جن کو تم نہیں دیکھ سکتے تھے اور اس نے کافروں کو عذاب دیا اور یہی ان کی سزا ہے۔

تیسری جگہ فرمایا ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۶۰)	اگر اللہ تعالیٰ تم کو فتح مند بنانا چاہے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو تو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

لہ یہ اس بات کی تصریح ہے کہ تم کو فتح مندی غیر مرئی اسباب کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔

موازنۂ صبر اور توکّل

امّید و بیم بھی سوال کی ایک قسم ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دعا کی دو قسمیں ہیں ایک دعا بمعنی عبادت ہے اور دوسری دعا بمعنی سوال اور دعا کی دونوں قسمیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہیں جس کسی نے کسی دوسری ہستی کو حاجت روا گردانا تو وہ ذلیل و خوار ہو گیا اور چونکہ کسی سے اپنی امید کو وابستہ کرنا بھی سوال کی ایک قسم ہے اس لیے یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ اسے چاہیئے کہ کسی دوسرے سے سوال نہ کرے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا اَتَاكَ مِنْ هٰذَا الْمَالِ وَاَنْتَ غَيْرُ سَائِلٍ وَلَا مُشْرِفٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ	جو مال تم کو ایسی حالت میں ملے کہ تم نے نہ تو سوال کیا ہو اور نہ تم اس کے نگران رہے ہو، اس مال کو لے لیا کرو اور اگر ایسا نہیں تو مت لو۔

نگران رہنے کے یہ معنی ہیں کہ آدمی اپنے دل میں اس مال کے مل جانے کا خواہاں ہو، اور اس کی توقع رکھتا ہو۔

ابو سعید خدریؓ کی روایت صحیحین میں ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت

سہے کہ ہم ایک مرتبہ بھوک کی مصیبت میں مبتلا ہوئے اور میں سوال کرنے کے ارادے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ خطبہ میں مشغول تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ :-

یا یہا الناس و اللہ مہما یکن عند نا من خیر فلن ندخرہ عنکم و انہ من یستغن یغنہ اللہ و من یستعفف یعفہ اللہ و من یتصبر یصبرہ اللہ و ما اعطی احد عطاء خیرا او سع من الصبر	اے لوگو! خدا کی قسم اگر ہمارے پاس مال موجود ہو گا تو میں ہرگز تم کو اس سے محروم نہیں کروں گا اور بیشک جو شخص بے نیازی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے اور جو شخص (اس ذلت سے) بری رہنا چاہتا ہے اللہ اس کو بری رہنے کی توفیق بخشے گا اور جو شخص تکلیف برداشت کر کے صبر اختیار کرے گا اس میں صبر کا ملکہ پیدا ہو گا اور صبر سے فراخ تر اور وسیع و بہتر بخشش کسی کو نہیں دی گئی۔

استغناء یعنی بے نیازی کے یہ معنی ہیں کہ اپنے دل کو بھی کسی چیز کی توقع میں نگراں نہ رکھے اور اس کے حاصل کرنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔

استعفاف یعنی بری رہنا، یہ ہے کہ زبان سے سوال نہ کرے۔

امام احمدؒ بن حنبل کا توکل یہی وجہ ہے کہ جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے توکل کی حقیقت دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا:

قطع الاستشراف الی الخلق مخلوقات سے اپنی امید و بیم کو توڑ دینا۔

یعنی توکل یہ ہے کہ تمہارے دل میں بھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ کوئی تم کو کچھ دے گا، اس

کی دلیل کی بابت استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں نے آگ میں ڈالا اور جبرئیل علیہ السلام نے آکر کہا:

ھل لك من حاجة ؟	آپ کو کسی چیز کی حاجت ہے؟

حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ما الیك --------	تم سے مجھے کوئی حاجت نہیں"

ایسی روایات سے صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو کسی نفع کی طلب میں یا کسی ضرر کے ارتفاع میں اپنا دل سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اسی بنا پر حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی دعا کو لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سے شروع کیا۔

ارشادِ نبوی بروقت تکلیف ۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی مصیبت اور تکلیف کے پیش آنے پر فرمایا کرتے تھے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ	بیشک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں،
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ رَبُّ الْعَرْشِ	وہ عظمت اور حلم کا خداوند ہے۔ بیشک
الْعَظِیْمُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ رَبُّ	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی آسمانوں
السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ	اور زمین کا پروردگار ہے اور عزت
وَرَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ	والے عرش کا مالک ہے۔

ان الفاظ میں سراسر توحیدِ الوہیت کا اظہار ہے اور یہ کہ مومن کی جملہ امیدیں اسی وحدہٗ لاشریک کے ساتھ وابستہ ہیں (تبارک وتعالیٰ رب العٰلمین واحسن الخالقین) یہ الفاظ بظاہر جملہ خبریہ ہیں لیکن ان کے ضمن میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں جیساکہ بارہا اس کا

اخلاص اور علوِ شانِ الوہیت

پابندیٔ احکام واطاعت عام لوگ اگرچہ اپنی زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے اور توحید الوہیت کا اقرار کرتے ہیں لیکن خلوص کے ساتھ اس کی حقیقت کا اعتراف کرنے کی شان دوسری ہے۔ کمالِ توحید کا لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اور اطاعت ہے۔ کلامِ مجید میں ہے:-

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ ھَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۝ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ (الفرقان: ۴۳، ۴۴)	کیا کبھی تم نے اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے ہوائے نفس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے، کیا تم اس شخص کے وکیل ہو؟ اور کیا تمہارا خیال ہے کہ اکثر ان میں سے سن سمجھ سکتے ہیں؟ یہ لوگ تو یقیناً چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر!

ہوائے نفس کو معبود ٹھہرانا اس لیے جس کسی کی محبت اور شیفتگی اپنی خواہشاتِ نفسانی کے لیے ہو۔ اس نے یقیناً ہوائے نفس کو اپنا معبود قرار دیا۔ اور یہی کیفیت مشرکوں کی ہے کہ جس چیز کو انہوں نے اپنی خواہشِ نفس کے مطابق پسند کیا۔ اسی کو معبود بنا لیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرہ : ۱۶۵)

یہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا رکھے ہیں جن کے ساتھ وہ خدا کی طرح محبت کرتے ہیں

اخلاص حضرت ابراہیم خلیل اللہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کے معبودوں پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر فرمایا تھا۔

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ (المائدہ : ۷۷)

میں غائب ہو جانے والی چیزوں کو پسند نہیں کرتا

یہ ایک امر واقع ہے کہ آپ کی قوم کے لوگ صانع عالم کے منکر نہیں تھے، لیکن جس چیز کو وہ پسند کرتے اور بزعم خود اس کو اپنے حق میں نفع رساں خیال کرتے تھے مثلاً سورج، چاند اور دیگر ستارے، انہی کو وہ پوجنے لگتے، خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو بتایا کہ جو چیز نظروں سے غائب ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عابدوں کا کلام سننے اور ان کا حال جاننے سے قاصر ہے اور ان کا نفع یا ضرر اس کے اختیار میں نہیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔

الغرض جس قدر بھی انسان توحید میں خلوص پیدا کرے، اسی نسبت سے اس کے دل سے غیر اللہ کو معبود ٹھہرانے کا خیال دُور ہو گا اور وہ گناہوں اور نافرمانیوں سے محفوظ رہے گا۔

مخلصین اور شیطانی تسلط اللہ تعالیٰ نے یوسف صدیق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○

اسی طرح ہم نے اس کے لیے عصمت کے سامان مہیا کیے تاکہ برائی اور بےحیائی کو اس سے دور رکھیں۔ بے شک وہ

(یوسف : ۲۴) | ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

برائی اور بے حیائی کو اپنے مخلص بندوں سے دور رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شیطان کو ان الفاظ میں مخاطب فرمایا ہے:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ (النحل : ۴۲)	بے شک ہمارے خاص بندوں پر تجھے کسی قسم کا تسلط نہیں ہوگا۔

اور اس کے جواب میں شیطان نے کہا:

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ (ص : ۸۳،۸۲)	خدایا تیری ذات کی قسم، ان سب کو بہکا کر چھوڑوں گا مگر جو تیرے مخلص بندے ہیں وہ بد راہی سے بچ جائیں گے۔

غرض شیطانی اکساوٹ اس قدر شدید ہونے کے باوجود بھی مخلص[1] بندے اس کی زد سے بچ نکلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان کے حق میں وعدہ ہے کہ شیطان کو ان پر کچھ بھی اختیار و تسلط نہیں۔

○○○○○○○○○

★★★★★★★★★

---

[1] اس لیے ہمیں خدا کے مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی سعی کرنی چاہیئے۔ ان کے سے عقاید ہوں اور ان جیسے اعمال بجا لائیں۔ (ناشر)

اخلاصِ کلمۂ توحید

دخولِ جنت از قولِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث مروی ہے کہ جو شخص خلوصِ قلب کے ساتھ کہہ دے "لا الٰہ الا اللہ" اس پر دوزخ کی آگ حرام ہو گئی، کیونکہ اخلاص کی بدولت آدمی ان اعمال کے ارتکاب سے محفوظ رہتا ہے جو انسان کو دوزخ کی آگ کا مستوجب بناتے ہیں اور یہ یاد رہے کہ جو شخص باوجود لا الٰہ الا اللہ کہنے کے دوزخ میں ڈالا جائے گا، اس کا سبب اخلاص کا فقدان یا کمی ہو گی اور اس کے دل میں شرک کا کوئی شائبہ موجود ہو گا، کیونکہ بعض اوقات شرک کا وجود چیونٹی کی چال سے بھی پوشیدہ تر ہوتا ہے، اس لیے انسان اپنے آپ کو اس سے مبرا خیال کرتا ہے۔

تجدیدِ اخلاص کا پروگرام اسی بنا پر انسان کو مامور کیا گیا ہے کہ وہ ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر اپنی توحید اور اپنے اخلاص کی تجدید کر لیا کرے۔ شیطان کی کوشش ہر وقت یہ رہتی ہے کہ وہ آدمی کو شرک میں مبتلا کر دے اور آدمی کا نفس ہمیشہ اس کی تلقین اور القاء کا اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے اور غیر اللہ کو بیم و امید کا قبلہ بنائے رکھتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی توحید کو خالص رکھنے کی کوشش کرے اور اسے شرک کی آمیزش سے پاک رکھے۔

ہلاکت آفرینیٔ شیطان ابن ابی عاصم وغیرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کی ہے کہ شیطان کہتا ہے:

اَھْلَکْتُ النَّاسَ بِالذُّنُوْبِ | میں نے لوگوں سے گناہ کرائے اور ان

وَ اَهْلَكُوْنِيْ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَالْاِسْتِغْفَارِ فَلَمَّا رَاَيْتُ ذٰلِكَ ثَبَتُّ فِيْهِمُ الْاَهْوَاءَ فَهُمْ يُذْنِبُوْنَ وَلَا يَسْتَغْفِرُوْنَ لِاَنَّهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا

کو ہلاک کیا لیکن انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہہ کر اور اللہ سے مغفرت طلب کر کے مجھ کو ہلاک کیا لیکن جب میں نے دیکھا تو ان کو خواہش نفس کی پیروی[1] میں لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ نافرمانی کرتے ہیں اور مغفرت نہیں طلب کرتے کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں ایک نیک کام کرتے ہیں

خواہش نفس کی پیروی

خواہش نفس کی پیروی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی ہدایت کو چھوڑ دے اور جو طبیعت میں آئے اس کو مانے اور عمل میں لائے ایسے ہی شخص کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے کہ:

مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (الفرقان: ۴۳)

جس نے ہوائے نفس کو اپنا معبود ٹھہرا لیا ہے۔

اس لیے وہ مشرک ہے اور اس کا شرک اس کے لیے مغفرت طلب کرنے سے مانع ہے۔

[1] عقاید اور اعمال میں ان کو بدعتوں کے ایجاد پر مائل کر دیا۔ (مترجم)

توحید اور استغفار کی نسبت

برخلاف اس کے جس شخص نے اپنی توحید کو خالص کر رکھا اور خدائے تعالیٰ سے اپنے گناہوں کے لیے مغفرت طلب کی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ دنیا اور آخرت کے شرور سے محفوظ نہ رہے۔ اس لیے ذوالنون (حضرت یونس) علیہ السلام کی دعا یہ تھی:۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء: ۸۷)	خدایا! تیرے سوا کوئی بھی میرا حاجت روا نہیں۔ بے شک میں خود ہی ظالموں میں سے ہوں۔

اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کی اکثر آیتوں میں توحید اور استغفار کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے:۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد: ۱۹)	تم جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کے لیے اور مومن مرد اور مومن عورتوں کے لیے مغفرت طلب کرو۔

اور فرمایا:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ	سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت مت

لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ — کرو۔ بے شک میں اللہ کی طرف سے
وَأَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ — تمہارے لیے ڈرانے والا اور خوشخبری
ثُمَّ تُوْبُوْا إِلَيْهِ — لانے والا ہوں اور بے شک تم اپنے
---------------- — پروردگار سے مغفرت طلب کرو اور اسی
(ہود ۲،۳) — کی طرف رجوع کرو۔

اسی سورہ میں قوم عاد کے قصہ میں بعینہٖ یہی الفاظ مذکور ہیں۔ اور فرمایا:۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُوْدًا — اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ
قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ — کو پیغمبر بنا کر بھیجا جس نے انہیں کہا اے
مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ — قوم! اللہ کی عبادت کرو کیونکہ اس کے
(ہود: ۵۰) — بغیر تمہارا کوئی معبود نہیں۔

اور فرمایا:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ — کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو
ثُمَّ تُوْبُوْا إِلَيْهِ (ہود: ۵۲) — اور توبہ کر کے اس کی طرف رجوع کرو

اسی سورہ میں قوم عاد کے قصہ میں بعینہٖ یہی الفاظ مذکور ہیں۔

سورۂ "فصّلت" کے پہلے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — (یا رسول اللہ) کہہ دو کہ بے شک میں تم
يُوْحٰى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ — جیسا انسان ہوں (فرق یہ ہے) میری طرف
وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْا إِلَيْهِ وَ — وحی کی گئی ہے۔ بے شک تمہارا معبود
اسْتَغْفِرُوْهُ — ایک ہے اور تم سیدھے ہو کر اس کی طرف
---------------- — متوجہ ہو جاؤ اور اسی سے مغفرت
(فصّلت: ۶) — طلب کرو۔

مجلس کے خاتمہ کی دعا - حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجلس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہونا چاہیے :

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ	اے خدا! تو پاک ہے اور تیرے لیے سب تعریفیں ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تجھی سے مغفرت طلب کرتا اور تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں۔

اگر وہ مجلس اچھی تھی تو یہ کلمات بمنزلہ مہر ہو جائیں گے۔ لیکن اگر وہ بیہودہ مجلس تھی، تو یہ کلمات اس کا کفارہ ہو جائیں گے۔

ادعیہ آخر وضو اور نماز - نیز ایک حدیث شریف میں ہے کہ وضو کے آخر میں یہ کہنا چاہیے :

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ واحد اور لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں میں اس بات کی کہ حضرت محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ خدایا! مجھ کو توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ بندوں میں بنا دے۔

یہ دونوں اذکار توحید اور استغفار پر مشتمل ہیں۔

ایک دوسری روایت میں وضو کے آخر میں بعینہٖ اُنہی کلمات کا کہنا منقول ہے، جو مجلس کے خاتمے پر کہے جاتے ہیں جو دین اسلام کی اصل واساس ہیں۔ کیونکہ دین تمام تر انہی دو شہادتوں میں داخل ہے۔ اس لیے ان ہر دو کا مضمون یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے

کسی کی بھی عبادت نہیں کرتے اور اس کے رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں۔ پس یہی دینِ اسلام کا خلاصہ ہے، اللہ کی عبادت بھی اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت سے کے ذریعے ہوتی ہے، اور ہر ایک فرضی اور نفلی عبادت بھی اسی اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول میں مضمر ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ کفارۂ مجلس کی دعا نماز کے آخر اور وضو کے آخر میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کے آخر میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ	یا اللہ مجھے بخش دے میرے وہ سب گناہ جو میں پہلے کرچکا ہوں یا بعد میں کروں گا، اور جو پوشیدہ کیے ہیں اور جو علانیہ کیے ہیں اور جو کچھ کہ تو میرے متعلق جانتا ہے، تو مقدم اور تو ہی مؤخر ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس میں بھی وہی استغفار اور توحید ہے۔ نماز کی دعا میں کلمۂ توحید کو اس لیے آخر دعا میں رکھا گیا ہے کہ نماز کا خاتمہ بہترین کلمہ پر ہو۔

افضل اور مفضول البتہ جہاں پر یہ بات مقصود بالذات نہیں وہاں توحید کو مقدم رکھا گیا ہے (مثلاً خاتمہ مجلس اور خاتمہ وضو کی دعائیں ہیں) کیونکہ بلحاظ نوعیت کے وہ دعا جس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کی ثنا اور تعریف ہو اس دعا سے بہتر اور افضل ہے جو سوال اور طلب پر مشتمل ہو۔ اگرچہ بعض موقعوں پر مفضول کو کسی خاص سبب کی بنا پر افضل سے ترجیح دی جاتی ہے، چنانچہ نماز مطلق قراءت سے افضل ہے اور قراءت قرآن کو ان اذکار پر ترجیح ہے جو حمد و ثنا پر مشتمل ہیں اور اس قسم کے اذکار ان دعاؤں پر فوقیت رکھتے ہیں، جن میں خالص سوال

اور طلب ہے لیکن بایں ہمہ بعض اوقات اور بعض جگہوں میں مفضول کو کسی خاص وجہ کی بنا پر فضل سے راجح مانا جاتا ہے۔

تمام ادیان کا نچوڑ بہرحال اس بات کو بخوبی یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کا آغاز اور انجام اور اس کا ظاہر اور باطن، توحید اور خالص توحید ہے اور دینِ اسلام تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ادیان کا زبدہ اور ملخص ہے اور لوگوں کے دلوں پر لا الٰہ الا اللہ کا گہرا نقش بٹھانا اس کا مقصد ہے۔

توحیدِ ربوبیّت اور توحیدِ الوہیّت

عام مسلمان لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کے مضمون کا سرسری اقرار کرتے ہیں لیکن توحید کو خالص بنانے میں ان کے درجات میں ایک وسیع اختلاف پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جس توحید کو فرضِ مؤکد قرار دیا گیا ہے، اس کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ کوئی شخص یہ اقرار کرے کہ ہر ایک چیز کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے اور وہی اس کی پرورش کا کفیل ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ توحیدِ ربوبیت اور چیز ہے اور توحیدِ الوہیت اور چیز۔

عقیدہ مشرکین عرب توحیدِ ربوبیت کا تو عرب کے مشرکوں کو بھی اقرار تھا، وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ آفرینندۂ عالم ایک نہیں، یا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور بھی ایسا خدا موجود ہے جو پروردگارِ مطلق کہلا سکے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں واضح طور پر ان کا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے (یعنی یہ کہ وہ خالقِ عالم کو ایک سمجھتے تھے) فرمایا:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ	اگر تم ان سے دریافت کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی

خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ○ (زخرف : ۹)	کہیں گے کہ ان چیزوں کو خدائے غالب اور باخبر نے پیدا کیا۔

اور فرمایا :

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ○	ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے بلکہ وہ مشرک ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○	(اے نبی!) ان سے پوچھیے، زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کی ملکیت ہے اگر تم جانتے ہو؟ تو کہیں گے اللہ ہی تو ہے۔ آپ پوچھیں ساتوں آسمانوں کا پروردگار اور بڑے عرش کا مالک کون ہے؟ اس کے جواب میں وہ ضرور یہ کہیں گے کہ اللہ ہی تو ہے، آپ پوچھیں تو پھر کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ پھر پوچھیں کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر ایک چیز کا کامل تصرف ہے اور کون دوسروں کو پناہ دیتا ہے اور خود پناہ نہیں چاہتا اس کے جواب میں وہ ضرور کہیں گے کہ وہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے، آپ پوچھیں کہ پھر تم کیوں سحر ہوئے پھرتے ہو؟
(المومنون : ۸۴ تا ۸۹)	

انکارِ توحیدِ الوہیت لیکن یہ مشرک باوجود اس اقرار کے کہ خالق ارض و سما اللہ ہی ہے اور وہی سب کا پروردگار ہے، خدا کی توحیدِ الوہیت کے معترف نہیں تھے جس کی انبیائے علیہم الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم دی ہے بلکہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا رکھا تھا جن کو بارگاہِ کبریائی میں اپنا شفیع خیال کرتے تھے، چنانچہ ان کا یہ قول قرآن کریم میں منقول ہے:

وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِندَ اللّٰهِ (یونس: ۱۸)	تو وہ کہتے ہیں ہمارے یہ معبود اللہ کے سامنے سفارشی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهٖٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ---------- (الزمر: ۳)	جن لوگوں نے غیر اللہ کو اپنا کارساز مقرر کر رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت (معبود سمجھ کر نہیں کرتے) بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ خدا کی بارگاہ میں ہمارے لیے حصولِ قرب کا موجب ہوں۔

غیر اللہ کے ساتھ محبت کرنا شرک ہے ان لوگوں کا شرک یہ تھا کہ وہ محبت، عبادت اور طلب حاجات میں دوسروں کو اللہ تعالیٰ کا شریک گردانتے تھے، اگرچہ اعتقاد اور اقرار کے لحاظ سے وہ موحد تھے۔ کلام پاک میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللّٰهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرۃ: ۱۶۵) ----------	لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو غیر اللہ کو اس کا شریک گردانتے اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں، جیسی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنی چاہیے۔

اس آیت کریمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص کسی مخلوق کے ساتھ ویسی محبت رکھتا ہے جو اس کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ رکھنی چاہیے تو وہ مشرک ہے اور اس آیت کے مفہوم

میں داخل ہے، چاہے وہ اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے اس کو پیدا کیا اور وہی اس کو رزق دیتا ہے۔

الحب للہ و الحب مع اللہ کا فرق

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ان دو شخصوں میں فرق بتایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے محبت رکھتا ہے اور وہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی اپنا محبوب قرار دے رکھا ہے، پہلے شخص کی محبت اور عبادت کا منتہیٰ اور مقصود فقط اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا بالاستقلال ان کا محبوب نہیں ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بعض بندوں سے یعنی انبیاؑ اور صالحین سے محبت ہے۔ اس لیے وہ بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کو ان کا بذاتِ خود محبوب بنانا مقصود ہے بلکہ اس لیے کہ وہ خدا کے محبوب ہیں۔

ترکِ محظورات اور بجا آوریٔ مامورات

اسی طرح وہ جانتا ہے کہ مامورات کا بجالانا اور محظورات کا ترک کرنا خدا تعالیٰ کو پسند ہے اس لیے وہ ایسا ہی کرتا ہے کیونکہ اس کی محبت خدا کی محبت کے تابع رہتی ہے۔ برخلاف اس کے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ (اپنی خواہشِ نفس کے مطابق) اس کے ساتھ کسی دوسرے کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے اور اپنی امید و بیم کو اس سے وابستہ کرتا ہے اور ہر حالت میں اس کی اطاعت کرتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس کو اپنا شفیع سمجھتا ہے، اگرچہ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے اس کو شفیع مقرر فرمایا ہے۔ فرمایا:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ (یونس:۱۸)	اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو کچھ نفع یا ضرر نہیں پہنچا سکتے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہمارے شفیع ہیں، ان سے پوچھو کیا تم اللہ کو وہ بات بتانا چاہتے ہو جو زمین و آسمان میں نہیں جانتا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں تو کوئی بھی اس قسم کا شفیع نہ آسمانوں میں ہے اور نہ زمین میں ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شفیع ہیں تو کیا وہ خدائے تعالیٰ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتے ہیں جو وہ نہیں جانتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (التوبہ: ۳۱)	ان لوگوں (یہودیوں اور عیسائیوں) نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء، ومشائخ اور عیسیٰ بن مریم کو خدا بنا رکھا ہے، حالانکہ ان کو تو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہی خدا کی عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی معبود نہیں اور وہ ان باتوں سے پاک و برتر ہے جن کے ذریعے وہ شرک کرتے ہیں۔

اس آیت سے نہایت صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء اور علماء ومشائخ کی تعظیم اور اطاعت میں اگر غلو کیا جائے تو یہ بھی شرک ہے چاہے وہ غلو کرنے

والا اس کو شرک نہ سمجھتا ہو۔

روایتِ عدی بن حاتم اس کی مزید توضیح عدی بن حاتم کی حدیث سے ہوتی ہے۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس آیت کے متعلق استفسار کیا تھا کہ ہم عیسائی لوگ تو اپنے علماء و مشائخ کو اپنا معبود نہیں سمجھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"وہ ان کے لیے حلال کو حرام کر دیتے تھے اور حرام کو حلال کر دیتے تھے، جس کی وہ بے تامل اطاعت کرتے تھے۔ یہی ان کی عبادت[1] تھی"

قرآن کریم میں ہے:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (شوریٰ: ۲۱)	کیا انہوں نے اپنے لیے خدا کے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنہوں نے ان کے لیے ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔

تعظیمِ مشائخ میں غلو واضح رہے کہ جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر کسی عالم، مجتہد یا شیخ طریقت[2] کے قول کا اس لیے اتباع کرتا ہے کہ وہ اس کا "قول" ہے

---

[1] یعنی اندھا دھند کسی کی تقلید کرنا بھی شرک ہے اور اس کو غیر اللہ کی عبادت کہتے ہیں۔

[2] کسی پیر و مرشد کی اس طرح تقلید کرنا پیر پرستی میں داخل ہوگی۔ اگر اس کی بات شریعت کے مطابق ہے تو اس کی پابندی عین شریعت کی پابندی ہوگی لیکن اگر وہ متبع شریعت نہیں تو خواہ وہ آسمان پر اڑا آئے، بے شمار کرامات کا ظہور اس کے ہاتھ پر ہو اس کی بیعت قطعاً حرام ہے اگر بیعت ہو جائے تو اس کا توڑنا فرض عین ہے۔ اگر نہ توڑے گا تو کافر زندیق اور اس میں کچھ فرق نہ ہوگا خسر الدنیا والآخرۃ ہو گیا۔

یقیناً وہ اس آیت کریمہ کے مفہوم میں داخل ہوگا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ○ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ○ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا ○	اور اس حالت کو یاد رکھو جب کہ ظالم آدمی (جس نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو پس پشت پھینکا تھا) انتہا درجہ کا افسوس کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا، کاش! میں نے پیغمبر خدا کے ساتھ رہنا، اس کے راستے پر چلنا اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ بے شک اس نے مجھے بہکا کر اللہ کے کلام سے دور پھینک دیا جب کہ وہ میرے پاس آچکا تھا اور بے شک شیطان انسان کو تکلیف کے وقت بالکل اکیلا چھوڑ دینے والا ہے۔
(الفرقان: ۲۷ تا ۲۹)	

چوتھا باب

اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول

رسولوں کی بعثت کا مقصد | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت تو اس لیے فرض ہے کہ آپؐ کی اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸۰)	جس شخص نے رسولؐ کی اطاعت کی تو بے شک اس نے خدا کی اطاعت کی

پس حلال وہی ہے جو رسولؐ نے حلال ٹھہرایا اور حرام وہی ہے جسے رسولؐ نے حرام قرار دیا اور دین وہ ہے جسے رسول نے شریعت قرار دیا اور کیوں نہ ہو، رسول کے بھیجنے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچائے اور اس کے احکام کی بے کم و کاست تبلیغ کرے لیکن رسول کو چھوڑ کر دوسرے علماء و مشائخ اور ملوک و علماء سب کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کا حکم اور ان کی ہدایت و ارشاد، اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت کے موافق ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۵۹)	اے مومنو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور مومن حاکموں کی اطاعت کرو۔

مامور من اللہ اور اولی الامر الرسول کے ساتھ اَطِیۡعُوۡا کا لفظ دوبارہ ذکر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ رسولؐ کی اطاعت بھی خدا کی اطاعت کی طرح ہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم بیان کریں تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کے ماننے میں چون وچرا کرے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور ہو کر حکم دیتے ہیں:

وَ مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (النجم: ۳، ۴)	وہ تو اپنی خواہش نفسانی سے کچھ بھی نہیں کہتا، اس کو تو وحی آتی ہے (تب وہ بولتا ہے)

برخلاف اس کے علماء اور مشائخ اور ملوک وامراء جن کو اس آیت میں "اولی الامر" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، کسی ایسی بات کا بھی حکم ان سے صادر ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ اور اس کے احکام کے خلاف ہو۔ اس لیے "اولی الامر" کے لفظ کو "الرسول" پر عطف کیا گیا ہے یعنی ان کی اطاعت کے لیے یہ شرط ہے کہ ان کا حکم "الرسول" کی تعلیم کے مطابق ہو۔ اس کی توضیح اسی آیت کے آخری حصہ سے ہوتی ہے کہ:

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ (النساء: ۵۹)	اگر بالفرض کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس اختلاف کا فیصلہ کرانے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔

دین کا ملخص اس تقریر کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے سے یہ بات بخوبی تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین کا ملخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کی جائے اور بس۔ ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف : ۴۰)	سوائے اللہ کے کسی کو حکم دینے کا حق حاصل نہیں ۔

اور فرمایا :۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال : ۳۹)	اور کافروں کے ساتھ لڑو، یہاں تک کہ کفر و شرک کا فتنہ ختم ہو جائے اور تمام تر اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو جائے (صرف اسی کا حکم مانا جائے)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ "یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اسے شجاع و بہادر کہا جائے ـــــ یا قومیت کی خاطر لڑتا ہے یا ریاکاری کی بنا پر تو کیا اسے مجاہد فی سبیل اللہ کا نام دیا جائے گا؟

آپؐ نے فرمایا :

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	مجاہد فی سبیل اللہ وہ ہے جس نے اس غرض سے جہاد کیا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔

غلو فی التوحید بہت سے لوگ کسی خلیفہ یا عالم یا شیخ یا امیر کو اس حد تک محبوب سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کو خدا کا شریک بنا دیتے ہیں اور گو وہ بظاہر یہی کہتے ہیں کہ ہماری محبت ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے لیکن جو شخص سوائے رسولؐ کے کسی اور کو یہاں تک بڑھا دیتا ہے کہ اس کے ہر ایک امر اور نہی کو بغیر چون و چرا کے تسلیم کر لیتا ہے، چاہے اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت ہوتی ہو تو سمجھ لو کہ اس نے اس کو خدائے تعالیٰ کا شریک بنا لیا۔

پیری مریدی کا جوشِ جنون اور کچھ بعید نہیں کہ عقیدت کا جوش اس کو اپنے محبوب کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے پر آمادہ کر دے جو نصاریٰ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا اپنے احبار اور رہبان کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی قضائے حاجات کے لیے اس کو پکارنے لگے، اس سے فریاد خواہی کرے، اس کے دوستوں سے محبت رکھے اور اس کے دشمنوں کو مبغوض سمجھے اور ہر ایک بات میں اس کی اطاعت کو لازم سمجھے[1]۔

بے شک یہ ارشادِ باری تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوا ہے کہ:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (البقرہ : ۱۶۵)	لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو غیر اللہ کو اس کا شریک گردانتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ جیسی اللہ کے ساتھ کرنی چاہیئے۔

[1] جیسے کہ اکثر مرید اپنے پیروں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں اور اپنے عقیدہ کی ترجمانی کے لیے یہ شعر زبان پر لاتے ہیں ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید (مترجم)

ایمان اور اسلام کا مفہوم

عقائد و اعمالِ قلب الغرض قلب کے اعمال میں بھی توحید اور شرک کی ویسی ہی حکومت ہے جیسی کہ قلب کے عقائد میں۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ :

التوحید قول القلب و	توحید، دل کا قول ہے اور توکل اس
التوکل عمل القلب	کا عمل ہے۔

اس توحید قولی سے آپ کی مراد قلب کی تصدیق ہے کیونکہ اس کو توکل کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ ویسے اگر توحید کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہ قلب کے قول (یعنی اس کی تصدیق) اور اس کے عمل دونوں کو شامل ہوتا اور توکل بھی توحید کا تتمہ ہے۔

اس کی مثال بعینہٖ ایمان کے لفظ کی ہے کہ اگر اس کو علیحدہ استعمال کیا جائے تو تمام ظاہر اور باطن کے اعمال اس کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں۔ عام طور پر سلف کا یہ قول مشہور ہے کہ :

" الایمان قول و عمل " جس کے یہ معنی ہیں کہ ایمان، قلب اور زبان کے قول اور قلب اور جوارح کے اعمال کا نام ہے۔ "

صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

الایمان بضع و ستون شعبۃ	ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں
اعلاھا قول لا الٰہ الا اللّٰہ	اعلیٰ شاخ لا الٰہ الا اللّٰہ کہنا اور ادنیٰ ترین
و ادناھا اماطۃ الاذی عن	شاخ یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دِہ

الطریق و الحیاء شعبة من الایمان	چیز کو ہٹا دیا جائے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○	یقیناً مومن وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے کبھی اس میں شک نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ایمان دار ہیں۔ (الحجرات: ۱۵)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ------- (الانفال: ۲تا۴)	یقیناً مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاوے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کی تلاوت ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں۔ اور وہ صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جو نماز کو قائم رکھتے اور جو چیز ہم نے ان کو بخشی ہے اس سے کچھ خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں۔

تیسری جگہ فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ (النور: ٦٢)	سچے مسلمان تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھیں اور جب کبھی رسولؐ کے ہمراہ کسی جمعیت کے کام میں جاتے ہیں تو اس کی اجازت کے بغیر ادھر ادھر کہیں نہیں جاتے۔

ہر مسلم مومن نہیں ایمان کا لفظ مطلق ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اسلام کے مفہوم کو بھی شامل ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ:

اٰمُرُكُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَ اَنْ تُؤَدُّوْا خُمُسَ مَا غَنِمْتُمْ ---------- ----------	میں تم کو ایک خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ خدا پر ایمان لانے کے کیا معنے ہیں؟ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں، نماز قائم رکھو، زکوٰۃ دیا کرو اور جو کچھ مال غنیمت تمہارے ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں ادا کیا کرو۔

اسی بنا پر سلف فرماتے ہیں کہ:

كُلُّ مُؤْمِنٍ مُّسْلِمٌ وَّ لَيْسَ كُلُّ مُسْلِمٍ مُّؤْمِنٌ	ہر ایک مومن مسلم ہے لیکن ہر ایک مسلم مومن نہیں ہے۔

حقیقت ایمان، اسلام، احسان الغرض مطلق ایمان کا لفظ استعمال ہو تو اعمال

اس کے مفہوم میں داخل ہوتے ہیں جیسے کہ تفصیل بالا سے ظاہر ہے لیکن اگر اس کے مقابلے میں اسلام یا عمل کا ذکر کیا جائے تو وہاں پر ایمان کا مفہوم یقین قلبی تک محدود رہتا ہے جیسے کہ کلام پاک میں کثرت سے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مذکور ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے ایک آدمی کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت دریافت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

○ اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ	ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں پر یقین کرو۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی تصدیق کرو اور خیر و شر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہونے کو تم باور کرو
○ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ تُقِیْمَ الصَّلٰوۃَ وَ تُؤْتِیَ الزَّکٰوۃَ وَ تَصُوْمَ رَمَضَانَ وَ تَحُجَّ الْبَیْتَ	اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج بجا لاؤ۔
○ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ------------	احسان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر بالفرض تم اس کو دیکھ نہیں سکتے تو اس میں شک

--------- نہیں کہ وہ تم کو دیکھ سکتا ہے۔

اس حدیث میں ایمان اور اسلام کے مفہوم کو الگ الگ بیان فرمایا ہے لیکن اس سے پہلے جو حدیث مذکور ہے اس میں چونکہ صرف ایمان کا ذکر ہے (یعنی اس کے مقابلے میں اسلام وغیرہ مذکور نہیں) اسلام کے مفہوم کو بھی اس کے مفہوم میں داخل بتایا ہے۔

منقاد و مطیع کی تشریح ظاہری اعمال، ایمان بالقلب کا نتیجہ اور اس کے مقتضی ہیں، جس کا بالفاظ دیگر یہ مطلب ہے کہ اگر دل میں ایمان ہوگا تو یہ ضروری ہے کہ جوارح سے بھی اس کے مناسب اعمال سرزد ہوں۔ ایمان بالقلب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نہ صرف اس کا دل جس چیز پر وہ ایمان لایا ہے اس کی بھی تصدیق کرلے بلکہ اس کے لیے منقاد اور مطیع ہو جائے۔ اس لیے اگر کوئی شخص دل سے اس بات کی تصدیق کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں لیکن اس کے دل میں آپؐ کی نسبت بغض اور حسد بھرا ہوا ہے اور وہ آپؐ کی متابعت سے سرتابی کرتا ہے تو سمجھ لیں کہ اس کا دل مومن نہیں ہے۔

حواس و ادراک سے بالاتر امور یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ ایمان کے مفہوم میں تصدیق کے معنی پائے جاتے ہیں لیکن ہر ایک تصدیق کو ایمان سے تعبیر نہیں کر سکتے مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ دو کا نصف ایک ہے یا آسمان ہمارے سروں پر ہے یا زمین ہمارے قدموں کے نیچے ہے یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو ان باتوں پر ایمان ہے بلکہ ایمان کا اطلاق ان امور کی تصدیق پر ہوتا ہے، جو حواس کے ادراک سے بالاتر ہوں اور ان کا جاننا بدیہی نہ ہو، جیسے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے باپ سے کہا:

وَمَآ أَنتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (یوسف: ۱۷)	آپ ہماری بات کو ماننے والے نہیں ----------

کیونکہ انہوں نے ایک ایسی خبر کی اطلاع دی تھی جو اُن سے پوشیدہ تھی اور وہ اس کے باور کرنے میں اختلاف کرتے تھے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ	پس موسےٰ پر سوائے اس کی قوم کے چند آدمیوں کے کوئی بھی ایمان نہ لایا۔ (یونس: ۸۳)

نیز فرمایا:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ---------- (التوبہ: ۶۱)	اور بعض ان میں سے وہ لوگ ہیں جو نبیؐ کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کان کے کچے ہیں۔ کہہ دو (اے نبیؐ!) وہ تمہارے فائدے کے کان ہیں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں پر یقین۔

یہاں ایمان باللہ اور ایمان بالمومنین میں فرق کیا گیا ہے جس سے مراد مومنوں کی تصدیق کرنا ہے۔

بہرحال ایمان باللہ سے مقصود اقرار لسانی ہے جیسے فرعون اور اس کے سرداروں کا قول ہے جو حضرت موسےٰؑ اور ہارونؑ کے متعلق انہوں نے کہا۔ قرآن میں ہے:

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (المومنون: ۴۷)	کیا ہم ان پر ایمان لائیں جو ہماری طرح دو آدمی ہیں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کا اقرار اور تصدیق نہیں کرتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ	کیا تم اس بات کی امید رکھتے ہو کہ وہ تم پر ایمان لے آئیں گے، حالانکہ

مِنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ	ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا ہے اور پھر سمجھ لینے کے بعد اس کی تحریف کر دیتا ہے (البقرہ: ۷۵)

دوسرے معنی کے متعلق فرمایا:

يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ (البقرہ: ۳)	وہ غیب کی حقیقتوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

اور فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۤـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ (البقرہ: ۲۸۵)	جو کچھ اللہ کی طرف سے اتارا گیا ہے اس پر رسول اور مومن ایمان لاتے ہیں اور اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر۔ (اور کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے

اور دوسری جگہ فرمایا:

لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰۤـئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (البقرہ: ۱۷۷)	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر، آخرت کے دن پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتاب پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لانا یعنی سب کا اقرار کرنا۔

اور اس طرح قرآن شریف میں کثرت سے آیات آئی ہیں۔

مومن اور کافر کی شناخت الغرض ایمان بعض امور غیبیہ کے ماننے کا نام ہے اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ قلب میں اس کی تصدیق پر عمل بھی پایا جائے۔

کیونکہ اگر ایک آدمی جانتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں لیکن اس کے دل میں ان کی محبت اور تعظیم نہیں بلکہ اس کے بجائے بغض اور حسد سے اس کا دل لبریز ہے اور وہ آپؐ کے اتباع کو اپنے لیے کسرِ شان سمجھتا ہے ایسے شخص کو مومن نہیں بلکہ کافر کہیں گے۔ ابلیس، فرعون، اور بعض اہل کتاب کا کفر اسی قسم کا ہے۔

انکارِ شیطانی کی نوعیت ابلیس اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس پر شرف بخشا ہے اور اس کے حکم سے وہ ملائکہ کا مسجود قرار پایا ہے لیکن اس کا تجبر اس کو اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ حکمِ الٰہی عزوجل کی تعمیل میں اپنا سر خم کرے۔ اسی تجبر و غرور کی بدولت وہ راندۂ درگاہِ الٰہی قرار پایا۔

فرعون کا انکار اسی طرح فرعون بھی جانتا تھا کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام ایک سچا رسول ہے۔ قرآن میں ہے:-

وَجَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ۔۔۔۔۔۔ (النمل : ۱۴)	باوجودیکہ فرعون اور اس کی قوم اپنے دلوں میں یقین کرتے تھے کہ حضرت موسےٰ کی لائی ہوئی نشانیاں سچی ہیں لیکن پھر بھی انہوں نے از راہِ تجبر و عناد ان کا انکار کیا۔

دوسری جگہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کا قول منقول ہے جس سے آپ نے فرعون کو مخاطب فرمایا ہے۔ قرآن کا بیان ہے:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ	اے فرعون! بے شک تم جانتے ہو کہ یہ نشانیاں (جو چراغِ بصیرت ہیں) اسی خدا نے نازل فرمائی ہیں جو

يَفْرَعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۱۰۲)	آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور بیشک میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو کر رہو گے۔

اہل کتاب کے حق میں وارد ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ: ۱۴۶)	جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح کوئی اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے (اور اس کی شناخت میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

علم اور عمل کی ناموافقت بنا بر دلائل مذکورہ بالا اگر دل میں علم تو ہو لیکن عمل قلب اس کے موافق نہ ہو تو یہ علم و دانش کچھ بھی مفید نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سخت ترین عذاب اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں اکثر فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَنَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَدُعَاءٍ لَا يُسْمَعُ وَقَلْبٍ لَا يَخْشَعُ	خدایا! میں تیری پناہ میں آتا ہوں، ایسے علم سے جو نفع رساں نہ ہو اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو اور ایسی دعاء سے جو قبول نہ ہو اور ایسے قلب سے جو عاجزی نہ کرے۔

فرقہ جہمیہ کا اعتقاد بایں ہمہ فرقہ جہمیہ کا خیال ہے کہ صرف تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے اور جہاں کہیں شریعت نے کسی کے حق میں یہ کہا کہ وہ مومن نہیں تو سمجھ لو کہ اس

کے قلب میں تصدیق نہیں تھی لیکن ایسا خیال کرنا ایک بہت بڑی جہالت ہے اوران کے اس قول سے یہ لازم آتا ہے کہ مومن اور کافر میں کچھ فرق نہیں۔ وکیع بن الجراح اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ نے ایسے لوگوں کو جن کا یہ اعتقاد ہو، کافر کہا ہے۔

تصدیقِ قلبی اور عملِ قلب

الایمان قولٌ وعملٌ | یہ ایک مانی ہوئی اور معلوم بات ہے کہ انسان بعض اوقات حق اور باطل کو پہچانتا ہے تاہم کسی خاص غرض کے لیے حق کو تسلیم کرنا اس پر شاق ہوتا ہے اور وہ اس کو مبغوض سمجھتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ازراہِ تکبر حق کا انکار کرتا ہے وہ دل میں بھی اس کی حقانیت کا قائل نہ ہو لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت فقط تصدیقِ قلبی کا نام نہیں بلکہ عملِ قلب بھی اس میں شامل ہے جس کی پہلے تشریح کی گئی ہے اس لیے سلف صالحین فرمایا کرتے تھے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ

ایمان کا مقتضیٰ | اب تم یہ سمجھ لو کہ جب دل میں تصدیق کامل کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی محبت بھی بدرجہ اتم موجود ہو جو بہر حال ایمان کا مقتضیٰ ہے، تو یقیناً اس محبت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے دل میں اعمالِ صالحہ کے لیے جازم ارادہ پیدا ہو گا۔ اس حالت میں اعمالِ صالحہ کا ظہور میں آنا قطعی ہے کیونکہ جازم ارادہ کے ساتھ اگر قدرت علی العمل بھی موجود ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عمل جس کا ارادہ کیا گیا ہے ظہور میں نہ آئے کیونکہ یقینِ کامل کے ساتھ اعمالِ صالحہ لازمی ہیں۔

ارادہ اور قدرت کی کمزوری | کسی عمل کے وجود میں آنے سے صرف دو باتیں مانع

ہو سکتی ہیں۔ ناقص اور کمزور ارادہ اور ناقص قدرت لیکن اگر ان دونوں صفات میں کوئی نقصان نہیں تو افعال اختیار کا وجود میں آنا قطعی اور لازمی ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جب دل اس بات کا قائل ہے کہ حضرت محمدؐ اللہ کے سچے رسول ہیں اور آپؐ کی محبت بھی علی الکمال قلب میں موجود ہے تو ممکن نہیں کہ وہ شخص باوجود قدرت کے زبان سے اقرار نہ کرے۔ یہ اور بات ہے کہ گونگا ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر وہ زبان سے شہادت کا اظہار کرنے سے قاصر ہو ورنہ دلی جذبات کا اقرارِ لسانی ضروری ہے۔

نقص یقین ابی طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کو اگرچہ اس بات کا یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں۔ ساتھ ہی اس کو آپؐ سے محبت بھی تھی لیکن اس کی یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کی محبت خون کے تعلق پر مبنی تھی کیونکہ آپؐ اس کے بھتیجے تھے اور وہ آپؐ کا غلبہ اور تفوق اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ آپؐ خدائے تعالیٰ کے رسول ہیں بلکہ اس لیے کہ آپؐ کے غلبہ اور تفوق حاصل کرنے میں خود اس کی اپنی عزت اور تفوق کا راز مضمر تھا لیکن جب اس کی موت کا وقت قریب آگیا اور دنیاوی تفوق کے متعلق اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں تو اس نے اپنے آباء و اجداد کے دین پر قائم رہنے کو بھتیجے کی رضامندی حاصل کرنے پر ترجیح دی اور توحید و رسالت کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کی محبت ابوبکر صدیق، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر مومنوں کی طرح نہیں تھی جو آپ کو اس لیے محبوب سمجھتے تھے کہ آپ خدا کے برگزیدہ سچے رسول ہیں۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد[1] ہے:

---

[1] جملہ مفسرین کے نزدیک یہ آیت حضرت ابو بکرؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے اور آپ کا سارا مال و دولت رضائے الٰہی کے حصول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف تھا۔ (ناشر)

وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی ○ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰیٓ ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ○ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ○ (اللیل ۹۲: ۱۷تا ۲۱)	عنقریب اس دوزخ سے وہ بڑا پرہیزگار بچالیا جائے گا جو اپنا مال تزکیہ حاصل کرنے کو دیتا ہے اور کسی کا اس پر احسان نہیں تھا کہ اس کا وہ بدلہ اتارتا ہے ۔ صرف اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کو خرچ کرتا ہے ۔ وہ جلد راضی ہو جائے گا ۔

اور یہی وجہ تھی کہ ابوطالب کے تمام اعمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی اور آپؐ کی نصرت و تائید سب اکارت ہو گئے کیونکہ ان اعمال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا اس کا مقصود نہیں تھا ۔

ضرورتِ ایمان اور توحید اس سے صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور توحید میں تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ عمل قلبی کی بھی ضرورت ہے پس دین خالص وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور دین کامل نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ عمل کی تصدیق شامل نہ ہو کیونکہ دین اطاعت اور عبادتِ الٰہی کا نام ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں دو سورتیں توحید کے بارے میں نازل فرمائی ہیں، ایک سورۂ اخلاص اور دوسری سورہ "الکٰفرون" ۔ ان میں سے پہلی سورت توحید عملی اور توحیدِ قولی پر مشتمل ہے جیسے فرمایا :

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ○ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○	(اے نبیؐ!) فرما دیجئے اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا باپ اور نہ اس کا کوئی ثانی و ہمسر ہے ۔

اور دوسری سورہ کا مضمون ارادہ اور عمل کی توحید ہے جیسے فرمایا:

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ ۝ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۝ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ۝ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِىَ دِينِ ۝ (الکٰفرون: ۱تا ۶)	اے نبی! کہہ دو کہ اے قوم کفار! میں اس کی پرستش نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کی عبادت کرونگا جسے تم پوجتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

پہلی سورہ میں ان صفاتِ علیا کا بیان ہے جس سے علمی توحید کے مختلف پہلو واضح ہوتے ہیں اور دوسری میں غیر اللہ کی عبادت سے بیزاری کا نہایت مؤکد اظہار ہے اور یہ کہ عبادت خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

توکّل اور عبادت کا مفہوم

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، بعض الفاظ مثلاً "ایمان" وغیرہ ایسے ہیں کہ جب وہ کسی دوسرے لفظ مثلاً "اسلام" وغیرہ کے مقابلے میں مذکور ہوں تو ان کا مفہوم محدود ہوتا ہے لیکن الگ استعمال کیے جانے کی حالت میں ان کا مفہوم بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسی طرح "عبادت" کا لفظ بھی اگر توکل وغیرہ سے علیحدہ استعمال کیا جائے تو توکل اور دوسرے مقامات اس کے مفہوم میں داخل سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○	جنوں اور انسانوں کو اس لیے میں نے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (الذاریات: ۵۶)

اور فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ (البقرۃ: ۲۱)

یہاں جو عبادت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ تمام مامورات کی بجا آوری اور تمام منہیات سے باز رہنے کے مفہوم پر مشتمل ہے لیکن ایک دوسری جگہ توکل کو اس پر عطف کیا گیا ہے۔ جو مغائرت کی دلیل ہے۔ فرمایا ہے:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (النحل: ۱۲۳)	تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (الفاتحہ)	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں عبادت کا مفہوم محدود ہے۔

معانی عموم وخصوص وہ الفاظ جو کبھی عموم اور کبھی خصوص کے معنی دیتے ہیں منجملہ ان کے ایک لفظ "منکر" ہے جو اکثر "معروف" کے مقابلے میں استعمال ہو کر عموم کے معنی دیتا ہے مثلاً مسلمانوں سے خطاب ہے کہ ان کا اصلی مشن کیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم سب امتوں میں سے بہتر ہو جو لوگوں کے لیے بھیجے گئے ہو۔ اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

یا جیسے رسول خدا کو حکم ہوا کہ یہود ونصاریٰ سے اس طرح خطاب کریں:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَ يَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (الاعراف: ۱۵۷)	آپ ان کو نیک کام کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔

یعنی ہر ایک ایسی بات کہ عقل، شرع اور فطرت اس کا انکار کرے اور اس کو برا سمجھے اسے "منکر" سے تعبیر کیا ہے، اس میں ہر قسم کی بے حیائی بھی داخل ہے لیکن ذیل میں بے حیائی کو اس کا معطوف علیہ بنایا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ منکر کو محدود مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ	بیشک نماز کی پابندی انسان کو بےحیائی اور دوسرے برے کاموں سے روکتی ہے۔ (العنکبوت: ۴۵)

اور فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ	بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم انصاف کرو، احسان کرو، رشتہ داروں کو کچھ دیا کرو اور بے حیائی اور برے کاموں سے بھی وہ تم کو منع کرتا ہے۔ (النحل: ۹۰)

اسی طرح فقراء اور مساکین کا لفظ اگر ساتھ ساتھ استعمال کیا جائے تو ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہوتا ہے لیکن الگ الگ استعمال ہوں تو ایک کا مفہوم دوسرے کے مفہوم میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

مفہوم محبت، توکل، خوف الغرض خالص اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت رکھنا، فقط اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا، صرف اسی سے ڈرنا اور کسی دوسرے کا خوف دل میں نہ لانا، یہ سب باتیں توحید کے مفہوم میں داخل ہیں۔ محبت کے بارے میں یہ آیت کئی بار پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ	بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اس کا شریک بناتے ہیں اور ان کے ساتھ خدا کی طرح محبت رکھتے ہیں لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔
(البقرہ: ۱۶۵)	

اور فرمایا:

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ	(اے نبیؐ!) ان سے کہو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور

اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ التوبہ : ۲۴	تمہارا جمع کیا ہوا مال اور تمہاری تجارت کہ جس کی کساد بازاری کا خوف رکھتے ہو نیز تمہارے پسندیدہ مکان اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور اللہ کے رستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو اس وقت کے منتظر رہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو تمہارے سامنے لے آئے

اور فرمایا :

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ (النور : ۵۲)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس کی خاطر پرہیزگاری کرے پس ایسے لوگ ہی کامیاب ہوں گے ۔

یہاں اطاعت کو اللہ اور رسول دونوں کے لیے بیان فرمایا ہے اور خشیت اور تقوے کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مقرر رکھا ۔ اور فرمایا :

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ○ (التوبہ : ۵۹)	اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے دیے ہوئے پر راضی ہو جاتے اور کہہ دیتے کہ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اور اس کا رسولؐ اپنے فضل سے جلد ہی اور زیادہ دے دیں گے اور ہم اللہ کی طرف ہی راغب ہیں ۔

اور فرمایا :

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (الانشراح : ۸،۷)	اے نبی! جب (تبلیغ سے) فراغت پاؤ تو ریاضت کرو اور اپنے رب کی طرف رغبت کرو۔

یہاں ریاضت اور رغبت صرف اللہ کے لیے قرار دی۔

دوسری جگہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے محبت رکھنے کے نتیجہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ------------ (المجادلہ : ۲۲)	تم کوئی ایسی قوم نہیں پاؤ گے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے ہوں اور پھر وہ ان لوگوں سے محبت کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، چاہے وہ لوگ اس کے سگے باپ یا بھائی ہوں یا ان کے عزیز لخت جگر یا قبیلہ کے آدمی ہوں۔

توکل کے متعلق کئی جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝	اگر تم مومن ہو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ (المائدہ : ۲۳)

خشیت کے باب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (الاحزاب : ۳۹)	(اللہ کے رسول) اللہ ہی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے اور کسی کا خوف دل میں نہیں لاتے۔

ان سب باتوں کا ذکر ہم نے کسی دوسری جگہ پر پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔

خلاصۂ بحث یہاں پر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس قول میں "لا الٰہ الا انت" توحید الوہیت کا اعتراف ہے اور اس کے مفہوم میں قلب کی تصدیق اور اس کا عمل دونوں شامل ہیں۔ مشرکینِ عرب کو اس بات کا اقرار تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی سب اشیاء کا خالق اور رازق ہے لیکن وہ الوہیت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے تھے حالانکہ توحید الوہیت کے یہ معنی ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور سوائے اس کے کسی اور کو قبلۂ حاجات نہ ٹھہرایا جائے۔ روزمرہ ہر ایک نماز کی ہر ایک رکعت میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر اسی عقیدہ کا اظہار اور اس کی تجدید کی جاتی ہے۔

نام نہاد صوفیہ کو نصیحت

غیر مشروع توجہات بعض اوقات آدمی صرف اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے اور اسی کی ذات پاک پر اس کا بھروسہ ہوتا ہے لیکن اس کا یہ سوال اور اس کا یہ توکل ان امور کی بابت ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا، بلکہ ان سے اس کو منع فرمایا ہوتا ہے اس سے ہماری مراد وہ نام نہاد صوفیہ ہیں جو غیر مشروع توجہات کے حامل ہیں اور ان کا کشف اور تصرف ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف ہیں۔

ان کا مطمح نظر اکثر ان میں سے اللہ ہی سے مدد کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ دنیاوی زندگی میں کامیاب

رہوں تو ہوں لیکن آخرت میں ان کو کسی بہتری کی توقع نہیں رکھنا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ○
(بنی اسرائیل: ۶۷)

جب تم کو سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو تم جن کی خدا کے سوا عبادت کرتے ہو انہیں بھول جاتے ہو، پھر جب اللہ تمہیں خشکی پر بچا لاتا ہے تو تم اس سے اعراض کر لیتے ہو، بیشک انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔

اور فرمایا،

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ---------
----
(یونس: ۱۲)

جب انسان کو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ خواہ پہلو پر لیٹا ہو یا بیٹھا ہو یا کھڑا ہو، پھر جب ہم اس کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو اس طرح گزر جاتا ہے گویا اس نے ہمیں اس مصیبت کے لیے پکارا ہی نہ تھا جو اسے پہنچی تھی۔

اصلاحِ حال کی راہ اس لیے اپنی آخرت کو سنوارنے کے لیے اپنی زندگی کی جملہ حرکات و سکنات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وقف کر دینا لازم ہے۔ ارشاد ہوتا ہے،

وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا

اگر یہ لوگ مومن ہوں تو سب سے مقدم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی

مُؤْمِنِيْنَ ○	حاصل کرنا ان پر لازم ہے۔

سالکانِ راہ کی کوتاہیاں بعض دوسرے لوگوں کا نصب العین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ہوتی ہے لیکن توکل اور استعانت باللہ کے مقام سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی نیک نیتی اور خدا و رسول کی اطاعت کا یقیناً ثواب ملے گا لیکن جب تک وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرنے اور اسی کی ذات پاک پر بھروسہ رکھنے میں ثابت قدم نہ ہوں، اولاً تو ان کی کامیابی مشکوک ہے اور اس لیے بعض ان میں سے اثنائے سلوک میں ہی ہمت ہار جاتے ہیں: ثانیاً اگر وہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو خود بینی میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انہی حالتوں پر یہ آیت شریفہ صادق آتی ہے:

وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ○ (التوبہ: ۲۵)	اور جب جنگ حنین کے دن تم کو تمہاری کثرت نے مغرور کر دیا تو تمہیں کوئی چیز کفایت نہ کر سکی اور (بہ سبب شکست کے) زمین بھی تم پر تنگ ہو گئی اس لیے کہ تم نے خدا کا توکل چھوڑ دیا پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

اس کے بعد فرمایا:

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○	پھر اللہ اس کے بعد جس کی چاہے گا اپنی رحمت سے توبہ قبول کرے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے

امراضِ ریاء و عجب کا علاج اکثر اوقات ریا اور عجب (نمود اور خود بینی) کی صفت ایک ساتھ نمودار ہوتی ہے کیونکہ ان کی حقیقت ایک دوسرے کے قریب

قریب ہے۔ ریا میں کسی دوسری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنایا جاتا ہے[1] اور عجب میں اپنے نفس کو خدا کا شریک ٹھہرایا جاتا ہے[2]۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ پہلے مرض کا علاج ہے اور اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ دوسرے روگ کے استیصال کے لیے ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

ثَلٰثٌ مُّهْلِكَاتٌ شُحٌّ	تین چیزیں انسان کو ہلاک کر دیتی ہیں
مُطَاعٌ وَّ هَوًى مُّتَّبَعٌ	بخل اور حرص کے محرک پر عمل کرنا،
وَاِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ	خواہش نفس کی پیروی کرنا اور خود بین ہو جانا۔

جھوٹے پیروں کا فرقہ ان دونوں فرقوں سے بدتر ایک اور فریق ہے جن کی نہ تو عبادت اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے استعانت کرتے ہیں، ان کی عبادت غیر اللہ سے ہوتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ دونوں لحاظ سے مشرک ہیں۔ انہی میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو شیاطین سے استعانت کرتے ہیں اور ایسے اعمال بجا لاتے ہیں جن کو شیاطین پسند کرتے ہیں مثلاً کذب اور فجور۔ نیز وہ ان الفاظ میں دعائیں کرتے ہیں جن کو شیطانی القاء کا نتیجہ کہیں تو بجا ہوگا اور ایسے عملیات کا ورد کرتے ہیں جن کی وجہ سے شیطان ان کے مطیع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان لوگوں سے اس قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر ایسے واقعات اور کیفیات ظہور میں آتی ہیں جن کو ان کے معتقدین خارق عادت ہونے کی وجہ سے ولایت اور کرامت

---

[1] یعنی جو کام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کرنا چاہیے تھا وہ دوسروں کی نمائش کے لیے کیا جاتا ہے۔

[2] خدائے تعالیٰ کی تائید اور اعانت اور اس کی توفیق اور عنایت اس کو ملحوظ نہیں رہتی، بلکہ وہ اپنی ہی قوت پر نازاں ہوتا ہے اور قارون کی طرح سمجھنے لگتا ہے:

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ

خیال کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ سحر اور کہانت کی ایک قسم ہے۔ مومنوں کو چاہیے کہ وہ احوالِ ایمانیہ اور احوالِ شیطانیہ میں فرق کر لیا کریں۔

عقیدۂ اہلِ توحید چوتھی جماعت اہلِ توحید کی ہے جن کا دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اسی کی عبادت کرتے اور اسی کی ذاتِ پاک پر بھروسہ رکھتے ہیں کسی مصیبت زدہ کا یہ قول کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ" یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ اس کے قائل کے مدنظر ایک ہی قسم کی توحید ہو (مثلاً توحیدِ ربوبیت) لیکن جس پر اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہو، وہ دونوں قسم کی توحید کو ملحوظ رکھتا ہے۔ جو مصیبت زدہ اور صاحبِ حاجت شخص لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ کہتے ہوئے صرف اس بات کا استحضار کرتا ہے کہ سوائے اللہ تعالےٰ اور کوئی بھی ضرر کا دفع کرنے والا نہیں، اور نعمتیں بھی وہی نازل فرماتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ، توحیدِ ربوبیت پر مبنی ہے۔ سوال، طلب اور توکل کے لحاظ سے بھی وہ موحد ہے لیکن توحیدِ الوہیت کا مقام اس سے بالاتر ہے۔

توحیدِ الوہیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالےٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کرے اور نیز اس کی عبادت اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم کے موافق اور ان کی اطاعت پر مبنی ہو۔ ایسا شخص اس آیت شریفہ پر عامل ہے:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود: ۱۲۳)	اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔

اور فرمایا:

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (ہود: ۸۸)	میرا اسی (خدا کی) ذات پر بھروسہ ہے اور اسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

اور فرمایا:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ○ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ○ (مزمل: ۸، ۹)	اور یاد کر نام اپنے پروردگار کا اور جھک جا اس کی طرف پورا جھکنا، وہی رب ہے مشرق اور مغرب کا، نہیں ہے کوئی معبود اس کے سوا۔ پس اسی رب کو اپنا کارساز پکڑ۔

ایسے شخص کا مطلوب اگر کوئی حرام چیز ہے تو اس کے لیے سوال اور طلب کرنے کی وجہ سے گناہ ہوگا چاہے اس کی حاجت پوری ہو جائے اور اگر وہ کسی مباح چیز کا طلبگار ہے تو اس کے لیے ثواب یا عذاب کچھ نہیں لیکن اگر وہ کسی ایسی چیز کو خدائے تعالیٰ سے مانگتا ہے جو عبادت میں اس کے لیے معاون ہے تو بے شک ایسے شخص کو اجر ملے گا۔

بندہ پیغمبر اور بادشاہ پیغمبر

آنحضرت ﷺ کی ترجیح اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ بندہ پیغمبر اور بادشاہ پیغمبر میں کیا فرق ہے؟ وہ حدیث تمہیں یاد ہو گی جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا کہ وہ بندہ اور پیغمبر ہو کر رہیں یا بادشاہ پیغمبر کی زندگی بسر کریں چنانچہ آپ نے بندہ پیغمبر کی زندگی کو ترجیح دی۔

حکم مرسل کی تعمیل و تبلیغ بندہ پیغمبر کے یہ معنی ہیں کہ اس کے تمام حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا فعل نہیں کرتا جس کی بابت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو حکم نہ دیا گیا ہو۔ اس لیے بندہ پیغمبر کا ہر ایک فعل، حرکت اور

سکون عبادت ہے، وہ محض بندہ ہوتا ہے جس کا یہ کام ہوتا ہے کہ اپنے مرسل کے احکام کی تعمیل اور تبلیغ کرے۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول منقول ہے کہ:

انی واللہ لا اعطی احدا ولا امنع احدا وانما انا قاسم اضع حیث امرت	خدا کی قسم! میں نہ کسی کو کوئی چیز دیتا ہوں اور نہ ہی کسی چیز کا دینا روکتا ہوں۔ بیشک میں صرف تقسیم کرنے والا ہوں جو کچھ مجھے حکم ہوتا ہے اس کی تعمیل کرتا ہوں

آپؐ کا منع اور عطاء آپؐ کا یہ قول کہ کسی کو کچھ نہیں دیتا اور نہ ہی کسی چیز کا دینا روکتا ہوں"۔ اس بناء پر نہیں کہا گیا کہ قضاء و قدر نے آپؐ کو مسلوب الاختیار کر رکھا ہے کیونکہ جہاں تک قضاء و قدر کا تعلق ہے اس میں سب برابر ہیں۔ آپؐ کی کچھ بھی خصوصیت نہیں، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ شرعاً دینے یا نہ دینے میں میرا کچھ دخل نہیں۔ بالفاظِ دیگر میں اسی کو دیتا ہوں جس کے دینے کا مجھے حکم ہوتا ہے اور وہی چیز کسی سے روکتا ہوں جس کے روکنے ہی کا مجھے حکم دیا جاتا ہے، یعنی جس طرح میرے تمام افعال اور حرکات اس کی قضاؤ قدر کی صفتِ تکوین کے ساتھ وابستہ ہیں اسی طرح میرے تمام حرکات وسکنات (دینا اور نہ دینا وغیرہ وغیرہ) اس کے احکامِ تشریعی کے تحت تنفیذ ہیں۔ الغرض میں عطاء اور منع دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے احکام کا انتظار کرتا ہوں اور حکم ملنے پر اس کی تنفیذ کرتا ہوں۔ اموالِ صدقہ اور اموالِ غنیمت وغیرہ کو اپنی رائے کے موافق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تقسیم کرتا ہوں۔

فقہاء کی غلط توجیہیں اسی سلسلہ میں یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ قرآن کریم میں جہاں مال کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف کی گئی ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں خرچ کیا جائے

اور جیسے کہ بعض فقہاء کا قول ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مال کی تکوین اور تخلیق کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا ہے کیونکہ اس لحاظ سے تو ہر ایک مال اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ مال غنیمت کی کیا تخصیص ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (الانفال:۱)	اے نبی! فرما دیجئے، مال غنیمت تو اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق ہے۔

اور فرمایا:

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (الانفال: ۴۱)	لوگو! تم ایک بات کو بخوبی سمجھ لو کہ جو کچھ مال و دولت غنیمت کے طور پر تم کو حاصل ہو تو بلاشبہ اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ - - - - - - - (الحشر:۵)	اور جو مال فئے اللہ نے اپنے رسولؐ کو دلا دیا ہے اس طرح پر کہ تم کو اس پر گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر فوج کشی نہ کرنی پڑی (بلکہ) بلا محنت و مشقت حاصل ہوا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی (الحشر:۶)	(بنو نضیر خیبر والوں کی بستی ختم ہوئی) تو اس سے جو مال بغیر لڑائی کے حاصل ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حق ہے تاکہ ذی القربیٰ کو دیا جائے

اسی طرح یہ بھی مراد نہیں کہ وہ مال رسولؐ کی ملک ہے جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے۔ جن فقہاء کا یہ قول ہے انہوں نے متعدد وجوہ سے غلطی کی ہے۔

۱۔ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اموالِ غنیمت اور دیگر اموال کے نہ تو اس طرح مالک تھے جس طرح عام لوگ اپنی کسی مملوک چیز کے مالک ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہ آپؐ کو حق تصرف حاصل تھا جو بادشاہوں کو شاہی خزانے کا مال صرف کرنے کی بابت حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ عام لوگ اپنے اموال کو اپنی ذاتی اغراض کے حصول کے لیے خرچ کرتے ہیں اور بادشاہ اور سلاطین اپنی اور اپنے وزراء کی رائے اور صوابدید کے مطابق مصالح ملک وملت کو ملحوظ رکھ کر اپنے خزانہ کو صرف میں لاتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "بندہ پیغمبر" ہونے کی وجہ سے اس قسم کا تصرف نہیں کرتے تھے بلکہ عطا اور منع دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل درآمد فرماتے تھے اس لیے آپؐ کی ہر حرکت اور سکون عبادت تھی۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ رسول اللہ کو خمس میں تصرف کرنے کا حق حاصل تھا، جیسے امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے اقوال میں پایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مال، میراث کے طور پر ان کے وارثوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اس حکم میں تمام انبیاءؑ یکساں ہیں، چاہے وہ بادشاہ پیغمبر ہوں یا بندہ پیغمبر اور کوئی نبی یا رسول مال کا مالک نہیں ہوتا جس طرح دوسرے عام لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مال میراث کے طور پر تقسیم ہونے سے یہ امر زیادہ واضح ہوتا ہے۔ اب تم خود سوچ لو کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جو بادشاہ پیغمبر نہیں بندہ پیغمبر تھے کس طرح یہ کہا جاسکتا ہو کہ اگر کوئی مال آپؐ کی ملک تھا اور اگر آپؐ بادشاہ پیغمبر ہوتے تو آپؐ کو

مصلحتِ ملکی میں خرچ کرنے کا حق حاصل ہو مثلاً جیسے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا حال تھا۔ فرمایا:

ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (صٓ: ۳۹)	یہ ہماری بخشش ہے اب تم جس کو چاہو بخش دو یا رکھ دو۔ یہ بے حساب مال و دولت ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان اور اپنے عیال پر بقدرِ ضرورت خرچ کرتے اور باقی سب مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے راہِ خدا میں صرف فرماتے تھے اپنے پاس کچھ بھی ذخیرہ نہیں فرماتے تھے لیکن تم جانتے ہو کہ عام مالکوں کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں جس قدر مال تھا وہ سب اللہ اور رسول کا مال تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مال کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرتے اور اللہ تعالیٰ ہی کے احکام کے موافق اس کی تقسیم فرماتے تھے۔

۴۔ **آنحضرتؐ کا اجتہاد اور حکم صریح** چوتھے البتہ جن اموال کو وہ اس طرح مستحقین میں تقسیم فرماتے وہ دو قسم کے تھے:

۱۔ ایک وہ جن کے مصرف کی بابت آپ کو صریح حکم ملتا۔

۲۔ دوسرے وہ جن کا صرف کرنا آپؐ کے اجتہاد اور صوابدید پر مفوض کیا جاتا۔

جیسے کہ دوسرے امورِ شرعیہ میں بھی بعض چیزیں یعنی ان کے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین اور محدود ہوتے ہیں مثلاً نماز پنجگانہ اور سال بھر میں ایک مہینہ کے روزے رکھنا وغیرہ۔ لیکن بعض چیزوں کے متعلق مخصوص وقت اور مخصوص مکان کو ملحوظ رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد کے بموجب عمل پیرا ہوتے تھے لیکن یاد رہے کہ یہ اجتہاد بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق

اور اس کی طرف سے تلقین پر مبنی ہوتا تھا مثلاً بیوی کا نفقہ شرع کی طرف سے بلحاظ مقدار اور نوعیت کے مقرر نہیں بلکہ اس کی مقدار اور اس کی نوعیت کی تعیین عرف پر چھوڑ دی گئی ہے جو لوگوں کے مختلف طبقات کے مختلف طرز ہائے معاشرت کا لحاظ کر کے کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ جمہور فقہاء قول ثانی کے مؤید ہیں اور یہ درست ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندہ سے فرمایا تھا:

خُذِیْ مَا یَکْفِیْكِ وَ وَلَدَكِ ---- ----	اس قدر کفاف لے لو جو تمہارے لیے اور تمہارے بچہ کے لیے کافی ہو (دستور کے مطابق)

نیز عرفہ کے دن خطبہ میں فرمایا:

لِلنِّسَآءِ کِسْوَتُهُنَّ وَ نَفَقَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	عورتوں کے لیے کپڑا پہنانا اور انہیں نان نفقہ دستور کے مطابق دیا جائے۔

صوابدیدِ رسول ؐ اور حکم الٰہی الغرض جن امور کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت اور نسبت کی گئی ہے اس کی تقسیم اور اس کا اعطاء و منع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صوابدید پر منحصر ہے برخلاف اس کے بعض اموال مستحقین کو خود اللہ تعالیٰ نے معین فرما دیا ہے۔ اور ان کا حصہ بھی معلوم کر دیا ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔ مثلاً مالِ میراث کی تقسیم۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ حنین کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

لَیْسَ لِیْ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ اِلَّا الْخُمُسَ وَ الْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَیْكُمْ ----	جو کچھ تم کو اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت دیا ہے اس میں میرا کچھ بھی نہیں۔ البتہ اس کا پانچواں حصہ میرا ہوتا ہے اور وہ بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے۔

اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ ۴/۵ حصہ مال غنیمت کا حکم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم اور معین ہے کہ وہ ان لوگوں کا حق ہے جو واقعہ میں حاضر تھے، صرف ۱/۵ حصہ ایسا ہے جس کا صرف کرنا میرے اجتہاد اور صوابدید پر رکھا گیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو اس خمس میں تصرف کرنا خلفائے راشدینؓ کا حق قرار پایا جس کو وہ اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔ نبی کریمؐ نے جنگِ حنین کے موقعہ پر کچھ مالِ غنیمت تالیفِ قلوب کے لیے دیا اور فرمایا، یہی خمس اور مالِ غنیمت کی اصلی تقسیم ہے یہ دراصل مومنین کے دلوں کو خوش کرنے کو فرمایا، اور اسی لیے جب انصار میں سے کسی نے الزام لگایا اور جب الزام رفع ہوا، تو آپؐ نے لے یہی جواب دیا اور انہیں انعام دینا چاہا۔

بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ مالِ غنیمت تقسیم سے قبل غازیوں کی ملکیت نہیں ہوتی اور یہ امام المسلمین کا حق ہے کہ وہ اپنے اجتہاد اور صوابدید سے خرچ کرے۔

پانچواں باب

دُعائے یُونس علیہ السلام اور توحیدِ الوہیّت

عبادت اور دعا کا مفہوم | یہ ایک طرح للباب بات درمیان میں آگئی تھی۔ دراصل بتانا یہ تھا کہ جو خدائے تعالیٰ کے سچے بندے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے اور اسی سے اعانت طلب کرتے ہیں اور اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے مفہوم پر کما حقہٗ عمل پیرا ہوتے ہیں اور توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت دونوں ان کے عقیدے اور عمل میں شامل ہوتی ہیں کیونکہ جب دونوں الگ الگ استعمال ہوتی ہیں تو دوسری کے مفہوم کو لیے ہوتی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِکِ النَّاسِ ۝ اِلٰـهِ النَّاسِ ۝ (الناس: ۱تا۳)	کہہ دیجئے اے نبیؐ! میں لوگوں کے پروردگار، لوگوں کے بادشاہ اور لوگوں کے معبود کی پناہ میں آتا ہوں۔

نیز فرمایا:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (الفاتحہ: ۱)	سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

تقدیم و تاخیر عبادت و استعانت | عبادت دراصل غایت اور مقصود بالذات ہے جس کے لیے مخلوقات کو خدا نے پیدا کیا، اور ربوبیت اور اعانت اس کے حصول اور تکمیل کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لیکن عبادت پہلے اس لیے مذکور ہے کہ مومن

آدمی جب اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہتا ہے تو وہ ابتداءً عبادت کا قصد کرتا ہے اور اپنے قصد اور ارادہ کی ترجمانی اس عبارت سے کرتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ لیکن وہ بالیقین جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اعانت کے بغیر اس اہم مقصد میں کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ اس لیے فوراً اس کی زبان پر وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ جاری ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ علتِ غائی اور علت فاعلی میں ایک معروف و معلوم فرق ہے۔

موزوں ترین اسماءِ الٰہی ساتھ ہی یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عبادت کے ساتھ اللہ کے اسم پاک کو خاص مناسبت ہے کیونکہ اس کی عبادت اس کی صفتِ الوہیت کا مقتضیٰ ہے، لیکن سوال اور درخواست کے موقع پر "رب" کا اسم پاک موزوں تر ہے کیونکہ اپنے بندوں کے حوائج پورے کرنا اور اس کی اعانت کرنا اور اس کو توفیق بخشنا اس کی صفتِ ربوبیت کا ظہور ہے۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور مومنوں کی جتنی دعائیں قرآن کریم میں منقول ہیں، وہ سب "ربنا" اور "ربِّ" کے لفظ سے شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی دعا:

رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (الاعراف: ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم بہت خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے

اور حضرت نوح علیہ السلام کی دعا:

رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ اَسۡـئَلَكَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ	اے پروردگار! یقیناً میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس چیز کا سوال کرنے سے

(ہود: ۴۷)	جس کا مجھے علم نہ ہو۔

حضرت موسٰی علیہ السلام کی دعا:

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ (القصص: ۱۶)	اے پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔
اور: رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (القصص: ۲۴)	اے پروردگار! جو کچھ تو مجھے دیدے، بیشک میں اس کا محتاج ہوں۔

ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام من اللہ الجلیل کی دعا:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ (ابراہیم: ۳۷)	اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو ایسی وادی میں بسا دیا ہے جو غیر آباد ہے اور تیرے محترم گھر کے پاس ہے۔ اے پروردگار! تاکہ میری اولاد نماز کو قائم کرے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا:

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (ص: ۳۵)	اے پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو اس طرح کی سلطنت نہ ملے بیشک تو بڑا عطا کنندہ ہے۔

مومنوں کی یہ دعائیں ملاحظہ ہوں

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (البقرہ: ۲۰۱)	اے میرے پروردگار! مجھے دنیا اور آخرت کی بھلائی عطا فرما اور عذاب دوزخ سے بچا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا (آل عمران : ۸)	اے ہمارے پروردگار! ہمارے دل کو ہدایت دینے کے بعد ٹیڑھا نہ کر دینا۔

اولی الالباب کی دعاؤں کا اس طرح ذکر کیا ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران : ۱۹۱)	اے ہمارے پروردگار! یہ سب کچھ تو نے رائیگاں پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات پاک ہے پس ہمیں عذاب دوزخ سے بچا لے۔

وغیرہ وغیرہ بکثرت آیات موجود ہیں جو سب اسی طرح شروع ہوتی ہیں۔

حضرت امام مالکؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اس کو سخت برا جانتے تھے کہ آدمی اپنی دعا میں کہے: یا سیدی یا سیدی، یا حنان یا حنان بلکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیشہ انہی الفاظ سے دعا کرو جن الفاظ سے انبیاءؑ نے دعا کی ہے اور کہو: رَبَّنَا رَبَّنَا

داعیہ تخاطب الٰہی الغرض جب آدمی کے دل میں سوال اور درخواست کا خیال غالب ہو تو ربّ کے لفظ سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرنا مناسب ہوگا۔ اگرچہ سوال بھی خدا کے اسم "اللہ" ہی کے ذریعے کرنا مستحسن ہے۔ کیونکہ لفظِ اللہ ذاتی نام ہے جو اسم رب کو شامل ہے لیکن جب اس کے دل میں عبادت کا خیال ہو تو پھر اللہ کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ جب خدا کی تعریف کرے تو اللہ ہی کا ذکر کرے اور جب دعا کا ارادہ کرے تو بھی اللہ ہی کو پکارے۔

اقرارِ گناہ کی تقدیم و تاخیر یہاں پر ایک سوال[1] پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے پہلے توحیدِ الوہیت کا اعتراف کیا اور بعد ازاں اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ لیکن آدم علیہ السلام

[1] سوال نمبر ۵ کا جواب شروع ہوا۔

کی دعا میں بغیر کسی تمہید کے گناہ اور قصور کا اعتراف ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○

اس میں نکتہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو نزولِ عذاب سے ڈرایا تھا اور عذاب کے آثار ظاہر بھی ہو چکے تھے لیکن جب انہوں نے سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنا عذاب ہٹا دیا یونس علیہ السلام نے عذاب کو ٹلتا ہوا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ اس سے وہ اپنی قوم کی نظروں میں جھوٹے ثابت ہوں گے[1] اس لیے وہ جھنجلائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کیے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دیئے جس کی پاداش میں ان کے مچھلی کے پیٹ میں چلے جانے کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ (القلم: ۴۸)	(اے محمدؐ!) اپنے پروردگار کے حکم تک صبر کر اور مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے کی مانند نہ ہو جائیو۔

نیز فرمایا:

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ (الصّٰفّٰت: ۱۴۲)	پس اسے مچھلی نے نگل لیا اور وہ سخت شرمندہ اور نادم ہوا۔

اس سے تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس قصور کا باعث خواہش نفس تھی، یعنی وہ نہیں چاہتے تھے کہ جھوٹے ثابت ہوں اور قوم کے سامنے ان کی سبکی ہو جس قوم کی بنا خواہشِ نفسانی کے اتباع پر ہو اس میں ایک گونہ شرک پایا جاتا ہے[2]۔ اس لیے سب

[1] حضرت یونس کو اپنی قوم کے خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور ایمان لانے کا غالباً علم نہ تھا۔
[2] ایک حدیث میں ہے ما تحت ادیم السماء الہ یعبد اعظم عندہٗ بقیہ بر صفحہ ۱۲۲

سے پہلے (یونسؑ کو) توحیدِ الوہیت کا اعتراف کرنا ضروری تھا۔ اس لیے انہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ کہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا اور خواہشِ نفس کے بت کو پاش پاش کر دیا اور وَهُوَ مُلِيْمٌ کی ملامت کو اس اعترافِ حقیقت کے پانی سے دھو ڈالا اور پھر عرضِ حال بیان کیا۔

برخلاف اس کے آدم علیہ السلام کا قصور ان کی بے احتیاطی تھی، جس کا نتیجہ غلط فہمی اور اس کے بعد ارتکابِ جرم ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیطان نے ان کے سامنے قسمیں کھائیں اور اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام اس کی دشمنی کو بھول گئے (یہی بے احتیاطی تھی) اور جو کچھ شیطان کہتا چلا گیا، آپؑ نے اس کو سچ مان لیا اور اس لیے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ جس بات سے منع کیا گیا ہے اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے۔ شیطان نے ان کو یقین دلایا تھا کہ انہوں نے شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھا لیا تو وہ فرشتے بن جائیں گے (جن کا مقام اور رتبہ نوعِ انسانی کے مقام سے بالاتر ہے) اس لیے آدم علیہ السلام نے بزعمِ خود اپنے لیے ترقی مدارج حاصل کرنا چاہا تھا اور یہ فعل ہوائے نفس کے اتباع پر مبنی نہیں تھا۔ لہٰذا توحیدِ الوہیت کے اعتراف کی تجدید چنداں ضروری نہیں تھی۔ ضروری بات یہ تھی کہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے چنانچہ فوراً بول اٹھے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ......

خدا کا سچا بندہ اور حقیقی مومن جو حالت یونس علیہ السلام کو پیش آئی اور ان سے قصور اور گناہ سرزد ہونے کا باعث ہوئی۔ ایسی حالت جس شخص کو بھی پیش آئے اس کے دل میں فی الجملہ تقدیرِ ایزدی سبحانہٗ وتعالیٰ کے خلاف کچھ اعتراض سا پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور حکمت کے متعلق کسی نہ کسی شکل میں شبہات

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۵) من هوى متبع (ترجمہ) آسمان کے نیچے سب سے بڑا بت جس کی پرستش کی جاتی ہے وہ نفس کی خواہش ہے جس کو عربی میں "ہوائے نفس" کہتے ہیں۔

ظہور میں آتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنی فاسد رائے اور غلط خواہشِ نفس کی اپنے سے نفی کرے اور اس بات کا علم الیقین پیدا کرے کہ سچی حکمت اور صحیح طور پر رحمت اور عدل کا ظہور وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظہور میں آئے۔ انسان کا علم محدود ہے اور اس کی سچی حکمتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا اور اس کی رحمت اور عدل کے دقائق سمجھنے سے آدمی کی سمجھ قاصر ہے۔ خدائے تعالیٰ کا سچا بندہ اور حقیقی مومن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام میں اپنی رائے اور اپنی خواہشِ نفس کو ذرہ بھی دخل نہ دے۔ کلام پاک میں ہے،

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○	(اے محمدؐ!) آپ کے رب کی قسم! وہ کبھی مومن نہیں ہوں گے، جب تک وہ آپس کے ہر ایک جھگڑے میں آپ ہی کو حاکم نہ بنائیں اور پھر جو کچھ بھی آپ فیصلہ دے دیں اس کے متعلق ان کے دلوں میں ذرہ بھی تنگی نمایاں نہ ہو اور وہ اس کو پوری طرح تسلیم کر لیں
(النساء: ۶۵)	

ایمان اور عاشقانِ رسولؐ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ابو حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ	اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے آپ کو مومن خیال نہ کرے جب تک وہ اپنی خواہشِ نفس کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کر دے۔

حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

يَا رَسُولَ اللهِ وَاللهِ لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي	اے رسول خدا! اللہ کی قسم! آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

ان کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ	تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے آپ کو مومن خیال نہ کرے جب تک کہ میں اسے اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

کلام مجید میں ایک اور مقام پر ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ (التوبہ: ۲۴)	کہہ دو اگر تمہارے باپ اور تمہاری عزیز اولاد اور تمہارے بھائی (جن کو تم اپنا دست و بازو سمجھتے ہو) اور تمہاری بیویاں اور تمہارا قبیلہ (جس پر تمہاری طاقت کا دار و مدار ہے) اور وہ دولت جو تم نے کمائی اور وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور اپنی پسندیدہ جگہیں تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسولؐ (کی اطاعت) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول عذاب کے منتظر رہو۔

اس آیت میں وہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کرکے گن دی ہیں جو انسان کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں مزاحم ہوتی ہیں اور بتا دیا گیا کہ اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی محبت پر اڑ کر آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے اعتنائی برتے تو اس کا انجام یقیناً ہلاکت اور عذاب ہے جس کے لیے اسے منتظر رہنا چاہیے۔

محبتِ الٰہی کا جذبہ پس جب ایمان کا معاملہ اس قدر نازک ہے کہ ایمان اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک آدمی اپنے کاروبار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم اور منصف نہ بنائے اور پھر آپ کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم نہ کر دے، ہر خواہش رسول اللہ کی آوردہ شریعت کے تابع ہو۔ رسول اللہ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ انسان کو اپنی جان کی محبت اور اپنے اہل و عیال کی محبت سے مقدم رکھنا مطلوب و مقصود ہو تو پھر اللہ عز و جل کی محبت اور اس کے حکموں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا کیا ٹھکانا؟

اظہارِ کراہیت و ناپسندیدگی پس جو شخص یہ دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرے کہ لوگ اس کے خیال میں اللہ کے عذاب کے مستحق ہو رہے ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے اور انہیں معاف کر دے گا اور ان پر رحم کرے گا۔ اگرچہ ان کے اعمال ناپسندیدہ ہوں تو یہ بات دو حال سے خالی نہیں۔ یا وہ ارادۃً احکامِ الٰہی کی مخالفت ہو گی یا گمان ہو گا کہ علمِ الٰہی کی مخالفت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔ جب تم بھی اس حقیقت سے آشنا ہو جاؤ گے تو کراہیت و ناپسندیدگی باقی نہ رہے گی۔ یہی ہم کو حکم دیا گیا ہے اور اسی لیے ہم کو پیدا کیا گیا۔ ہم کو یہ ہرگز نہیں حکم دیا گیا کہ ہم اسے مکروہ جانیں اور اس پر غضبناک ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ تو اسے محبوب رکھتا ہے۔ کیونکہ:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝	یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

پس اس قسم کی کراہیت الوہیت الٰہی کی کراہیت ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسا شخص توحیدِ الوہیت کی تجدید کرے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ کے ذریعے اپنے عقیدۂ باطلہ کو محو کرلے، ہاں کفر و فسق، عصیان و طغیان کی کراہیت سے ہمیں نہیں منع کیا گیا۔

الغرض ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنی پسندیدگی اور عدمِ پسندیدگی کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور سخط کے تابع بنائیں۔ جس بات کو وہ پسند کرتا ہے اس کو ہم بھی پسند کریں اور جو بات اس کو ناپسند ہے اس کو ہم بھی مکروہ اور ناپسند سمجھیں اور اس کے امر اور نہی کا اتباع کریں اور اپنی رائے سے کسی چیز کو پسندیدہ یا ناپسندیدہ نہ خیال کریں۔

چھٹا باب

عصمت انبیاء علیہم السلام

مقصدِ تبلیغ رسالت یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کے متعلق مذہبِ سلف کی تحقیق کی جائے۔ تبلیغ رسالت اور احکام کو پہنچانے میں، جن کے پہنچانے کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں، بلا کم و کاست پہنچا دیتے ہیں اور کبھی کوتاہی اور غلطی نہیں کرتے۔ علماء امتِ محمدیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اس بارے میں وہ بالکل معصوم ہیں اور اسی لیے ضروری ہے کہ جو کچھ ان کے ذریعے پہنچا ہے اسے تسلیم کرنے اور ماننے میں کوتاہی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا	(اے نبی!) کہو ہم ایمان لائے ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور جو حضرت ابراہیم، اسماعیل اسحاق یعقوب اور ان کی اولاد علیہم السلام پر نازل ہوئی اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم کسی

نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرہ: ۱۳۶، ۱۳۷)

نبی میں فرق نہیں جانتے، بلکہ سب کو تسلیم کرتے ہیں پس اگر وہ لوگ تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو بے شک ہدایت یاب ہو گئے اور اگر اعراض کریں تو سمجھ لو کہ وہ شقی ہیں پس تمہارے لیے اللہ کافی کارساز ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

اور فرمایا:

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ (البقرہ: ۱۷۷)

اور لیکن نجات اس کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا اور روزِ آخرت پر اور اس کی کتابوں پر اور نبیوں کو تسلیم کر لیا۔

اور فرمایا:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ

رسول تو اس پر ایمان لے آیا جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوا اور مومن بھی ایمان لے آئے۔ سب نے اللہ اور اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے نبیوں کو مان لیا، ہم نے تو کسی نبی میں فرق نہیں ڈالا اور وہ یہ کہتے ہیں

الْمَصِيْرُ (البقرہ: ۲۸۵)	کہ ہم نے سن لیا اور قبول کر لیا۔ اے پروردگار تیری طرف ہی ہم نے لوٹنا ہے۔

برخلاف اس کے نبیوں کے بغیر کوئی شخص معصوم نہیں، اگرچہ وہ اولیاء اللہ ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر جملہ فقہاء کے نزدیک نبی کو گالی دینے والے کا قتل کر دینا واجب ہے اور غیر نبی کو گالی دینے والا ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

مَنْ سَبَّ نَبِيًّا مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ قُتِلَ وَ مَنْ سَبَّ غَيْرَهُمْ لَمْ يُقْتَلْ	جس نے نبیوں میں سے کسی نبی کو گالی دی وہ قتل کیا جائے گا اور جس نے نبیوں کے سوا کسی کو گالی دی وہ قتل نہ کیا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام اور حفاظت الٰہی

اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو معصوم اور محفوظ رکھنے کا خود ذمہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ	وہی غیب[1] کی باتیں جانتا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا البتہ (لوگوں کو ایسی باتوں سے مطلع کرنے کے لیے) وہ کسی کو اپنا رسول چن لیتا ہے اور پھر اس کے آگے پیچھے (فرشتوں کا) پہرہ لگا دیتا ہے[2] جب تک کہ وہ جان

[1] غیب کا لفظ اپنے وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے جنت اور دوزخ (بقیہ بر صفحہ ۱۳۰)

----------------	سے لے کر رسولوں نے خدائے تعالےٰ
----------------	کے پیغام (محفوظ طور پر بلا کم وکاست)
(الجن: ۲۸)	پہنچا دیے۔

اس قسم کی عصمت انبیاء علیہم السلام کے لیے ضروری ہے اور اسی کی بدولت نبوت اور رسالت کا مقصود حاصل ہوتا ہے۔ نبی کا لفظ "نبا" سے مشتق ہے اور اس کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبریں دینے والا"۔ اسی طرح رسالت کے معنی "پیغام" کے ہیں اور رسول بمعنی "اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچانے والا"۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ ہر ایک نبی اور ہر ایک رسول تبلیغ وترسیل احکام الٰہی میں معصوم ہو۔ بصورت دیگر اللہ تعالیٰ کا پیغام ناقص ہوگا جو ناممکن ہے تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے۔

اختلافِ علماء اور القاءِ شیطانی البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا نبی اور رسول کی زبان پر تلاوت کی اثناء میں کوئی ایسا کلمہ جاری ہو سکتا ہے جو شیطان کا القاء ہو اور جس کو بعد میں بذریعہ وحی باطل ٹھہرایا جائے، اس کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک تو اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور سلف کا بھی یہی مذہب ہے۔ قرآن و حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کلام مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	(اے نبیؐ) ہم نے آپ سے پہلے کوئی
مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ	ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا جس کو
اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ	یہ مرحلہ پیش نہ آیا ہو کہ جو نہی انھوں
اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي	نے کوئی آرزو کی تو شیطان نے اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹) کا حال بتانا اور اعمال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا عدم خوشنودی کا پتا دینا سب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

ملے تاکہ اس کی تبلیغ شیطان اور قوت واہمہ وغیرہ کے تصرف سے بالکل محفوظ رہے۔

الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (الحج: ۵۲، ۵۳)	کی آرزو میں کوئی نہ کوئی فتنہ ڈال دیا جس کے بعد اللہ نے شیطان کی وسوسہ اندازی کو مٹا دیا اور اپنی نشانیوں کو مضبوط کر دیا اور اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اس میں یہ مصلحت رہی ہے کہ شیطان کی وسوسہ اندازی ان لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہو جائے جن کے دل روگی اور سخت ہو گئے ہیں بلاشبہ یہ ظالم بڑی ہی گہری مخالفت میں پڑے ہیں۔ نیز یہ مصلحت بھی تھی کہ علم والے اس بات کو جان لیں کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اس طرح یہ ایمان لے آئیں اور ان کے دل میں عجز و نیاز پیدا ہو جائے یقیناً اللہ ایمان والوں کو کامرانی کی سیدھی راہ چلانے والا ہے۔

اہل حدیث کا عقیدہ ان آیات کے شانِ نزول میں یہاں جو قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سورہ نجم کو تلاوت کرنے اور اثنائے تلاوت میں شیطان کے بعض الفاظ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر جاری کر دینے کا منقول ہے وہ ایک معروف روایت ہے اور کتب تفسیر و حدیث میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ آیت میں بھی اس بات کا اندازہ موجود ہے کیونکہ شیطانی القاء کو مٹانا اور آیتوں کو قائم

رکھنا ہی یہ ظاہر کر رہا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کے نزول کے دوران فی الواقعہ کوئی ایسا اختلاط پیش آیا ہے اور آنا ممکن ہے جس کے رفع کرنے اور حق و باطل میں تمیز کر دینے کو نسخ اور احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اہلِ حدیث علماء کا یہی قول ہے۔

لیکن جو لوگ متاخرین میں سے اس کے خلاف ہیں۔ وہ پہلے گروہ پر یہ طعن کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں کہ سورۂ نجم میں یہ الفاظ داخل کیے جائیں:

تلک الغرانیق العلی و ان شفاعتھا لترتجی	یہ بزرگ ہستیاں بلند مرتبہ ہیں (لات اور عزیٰ وغیرہ بت) اور ان کی شفاعت کی بھی امید کی جاتی ہے۔

کیونکہ یہ الفاظ ہرگز ثابت نہیں ہیں اور جس نے ثابت جانا اس نے تسلیم کیا کہ القاءِ شیطانی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ایسے الفاظ ہرگز جاری نہیں ہو سکتے اور اپنی تائید میں یہ آیتِ قرآنی پیش کی:

إِلَّآ إِذَا تَمَنّٰٓى أَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهٖ (الحج: ۵۲)	تمام رسولوں کو یہ مرحلہ پیش آیا کہ ان کی آرزوؤں میں شیطان نے فتنہ ڈال دیا۔

صداقتِ نبوت کی مستحکم دلیل فریق مخالف نے جو اعتراض اس القاء پر کیے ہیں، وہ بعینہٖ مسئلۂ نسخ پر وارد ہوتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کا نسخ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق فی الرسالۃ ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے اور یہ کہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، کیونکہ کسی ایک بات کا حکم دے کر جب وہ بعد میں اس کو منسوخ بتاتے ہیں تو اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے بلکہ وہ مامور بندے ہیں اور جو کچھ حکم ملتا ہوا اسی کی تبلیغ فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا قول صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے

کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا ایک حرف بھی چھپانا چاہتے تو سب سے پہلے اس آیت کی تبلیغ میں کوتاہی فرماتے:

وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَی النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ	اور تم اپنے دل میں ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ طشت از بام کرنے والا تھا اور اس کے اظہار میں تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا سے ڈرنا زیادہ ضروری ہے۔
(الاحزاب: ۳۷)	

سچے اور جھوٹے کی پہچان یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص جھوٹا ہو اور اپنی نمود کا خواہاں ہو وہ ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ آج ایک بات کہہ کر کل اس کی تردید کرے بلکہ جو کچھ اس کے منہ سے نکل جائے وہ اس کی تائید اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے۔ برخلاف اس کے جو سچا نبی اور سچا رسول ہے وہ اپنی خواہش نفس کا تابع نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا تابع فرمان ہوتا ہے اور جو کچھ اس کو حکم ملتا ہے وہی لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ قطع نظر اس سے لوگوں کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملے یا لوگ اس نسخ کو اس کے تناقص پر محمول کریں جس میں اس کی صفت متصور ہو۔ پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ایک بات کو بغیر خفت محسوس کیے صاف صاف بیان کر دینا اس بات کی محکم دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکموں کو ثابت کر دیا اور جو القاء شیطانی تھا اسے باطل قرار دیا ہے اور یہ آپؐ کی صداقت کی بیّن دلیل ہے اور جھوٹا نبی ہونے سے بریت ہے اور یہی رسالت کی غرض و غایت ہے۔ آپؐ صادق المصدوق ہیں اور آپؐ کی رسالت کو جھٹلانا اسی لیے صریح کفر ہے۔

انبیاء اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کام

جمہور علماء کا قول لیکن جن باتوں کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے۔ ان میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت از روئے عقل ثابت ہے یا خلاف قیاس؟ پھر یہ جھگڑا ہے کہ کبائر سے معصوم ہیں یا صغائر سے؟ کفر سے پاک ہیں یا قبل از بعثت سے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جمہور علماء کا صحیح تر قول وہ ہے جس کی بنا پر سلف کے اقوال منقولہ پر یہ بات صادق آتی ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے (ان کے رتبہ کے موافق) گناہ صادر ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان پر مُصِر نہیں رہتے۔

استدلالِ معصومیتِ مطلقہ بعض علماء جو ان کو معصوم مطلق سمجھتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اقتداء یعنی ان کے افعال کی پیروی کرنا امت پر لازم ہے اس لیے اگر ان سے گناہ کا صادر ہونا ممکن ہو تو اقتداء میں خلل آتا ہے۔ پس نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ ان کا اقتداء ان افعال میں کیا جاتا ہے جن پر وہ قائم رہے اور جن سے انہوں نے رجوع نہیں کیا، چنانچہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے امر اور نہی کا اتباع کرنا بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر اور نہی بعد میں منسوخ نہ ہو گئی ہو۔

منافی کمال اور فضیلتِ توبہ مطلق عصمت کے قائلین کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ گناہ کا صادر ہونا کمال کے منافی ہے[1] اور ان کا یہ ارتکاب ذنوب لوگوں کے لیے نفرت

---

[1] اور یہ مانا گیا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بنی نوع انسان کے کامل ترین افراد ہیں۔

کا موجب ہوگا۔ اور اس لیے رسالت کا مقصود کا حصہ پورا نہیں ہوگا لیکن یہ دلائل بھی اس حالت میں مؤثر ہو سکتے ہیں جب کہ یہ کہا جائے کہ وہ گناہ پر مُصر رہتے ہیں لیکن اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اب جیسا کہ ہم نے ابھی جمہور علماء کا قول نقل کیا ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ "گناہ ان سے صادر ہوتے ہیں لیکن وہ ان پر مُصر نہیں ہوتے" فوراً تائب ہو کر خدا کے حضور طالبِ معافی ہوتے ہیں۔

اور تم جانتے ہو کہ وہ سچی توبہ جس کو بارگاہِ کبریا میں شرفِ قبولیت حاصل ہو جائے اس کے بعد انسان اپنی قبل از توبہ حالت کے مقابلے میں بلند تر درجہ پر فائز ہوتا ہے چنانچہ بعض سلف سے منقول ہے کہ توبہ کے بعد داؤد علیہ السلام قبل از توبہ والے داؤد سے افضل تھے۔ کلام مجید میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○	بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (البقرہ: ۲۲۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ الفرقان: ۷۰	لیکن جس شخص نے توبہ کی اور ایمان لا کر نیک اعمال کیے ان لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل کر دے گا۔

صحیح حدیث میں بیان ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کے صغائر خدا کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور اس کے کبائر چھپا دیے جائیں گے کیونکہ وہ کبائر کو ظاہر کرنے سے بچتا تھا، پس اللہ سبحانہٗ فرمائیں گے، "میں نے تیرے گناہ معاف کر دیے اور تیرے ہر ایک گناہ کو نیکی میں بدل ڈالا" اس سے ظاہر ہوا کہ اس کی معافی کی حالت پہلی حالت سے یقیناً بہتر ہوگی۔

مرضِ خود بینی کی سزا | سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے سلف صالحین کا قول ہے کہ:

اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ الْحَسَنَةَ فَيَدْخُلُ بِهَا النَّارَ وَاِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ السَّيِّئَةَ فَيَدْخُلُ بِهَا الْجَنَّةَ	بعض اوقات انسان نیکی کرتا ہے اور دوزخ میں جاتا ہے اور کبھی برائی کرتا ہے تو جنت میں داخل ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے اپنے اس قول کی تشریح اس طرح پر کی کہ آدمی نیکی کر کے اس پر نازاں ہوتا ہے اور خود بین بن جاتا ہے۔ اس کا انجام دوزخ ہے، برخلاف اس کے برائی کر کے آدمی کے دل میں خدائے تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، وہ اس کی طرف رجوع کرتا اور تائب ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرماتا ہے۔[1] جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِيُعَذِّبَ	اور منظور کر لیا انسان نے اس (بارِ امانت) کو، بیشک وہ ظالم اور جاہل ہے۔ عذاب

[1] صحیح حدیثوں سے حرف بحرف اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ منجملہ ان کے بنی اسرائیل کے ایک بڑے عابد نے ایک خطاکار کے متعلق یہ کہا کہ خدا کی قسم! یہ نہیں بخشا جائے گا تو اس خود بینی سے اس کی تمام نیکیاں برباد ہو گئیں اور وہ دوزخ میں ٹھونس دیا گیا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے ایک دوسرے شخص کا قصہ ہے کہ اس نے اپنی تمام عمر میں ایک بھی نیکی نہیں کی تھی لیکن مرتے وقت اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا اور اس نے اپنی نعش کو جلا دینے اور اس کے بعد اس کی خاک کو ہوا میں اڑا دینے کی وصیت کی جس پر خدائے تعالیٰ نے اس کو بخش کر جنت میں داخل کر دیا۔ یہ دونوں قصے صحیحین میں مذکور ہیں اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے قول میں جس اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے لیے بمنزلہ شاہد عدل کے ہیں۔ (مترجم)

اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب : ۷۳)	میں مبتلا کرے گا اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اور پھر آ سے گا اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی طرف اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

الغرض قرآن، حدیث اور دیگر کتب سماویہ تمام اس قول کی مؤید ہیں اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

انحراف مسلمہ اصول اور فقدانِ ایمان

انبیاء کا قصور اور دور از کار تاویلیں پھر اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں متعدد آیتوں میں حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ کہہ کر مخاطب فرمایا ہے اور قرآن اور حدیث میں اس بات کی تصریحات موجود ہیں کہ پیغمبروں سے گناہ[1] اور قصور سرزد ہوا جس پر وہ نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرکے مغفرت طلب کی، یہ ایک مسلمہ اصول ہے لیکن ایک دوسرا فریق ان نصوص کی ایسی ہی دور از کار تاویلیں کرتا ہے جو اُن قرامطہ اور جہمیہ اور باطنیہ کی تاویلات کے مشابہ ہوتی ہیں، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنٰے اور صفاتِ علیا کے حقائق کی ایسی ہی تاویلیں کرکے انکار کیا ہے

[1] لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کے علو مرتبت کے لحاظ سے یہ گناہ اور قصور تھا مگر "حسنات الابرار" اور "سیئات المقربین" کے زریں اصول کو ہرگز نہ بھولنا چاہیئے۔

یہ لوگ بزعم خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم کرنا چاہتے ہیں، جس میں اپنی رائے کو استعمال کر کے دانستہ یا نادانستہ ان کی تکذیب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حصولِ سعادت کا حکمی نسخہ علاوہ ازیں وہ لوگ جس قسم کی عصمت کا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے دعوے کرتے ہیں، اگر وہ ثابت بھی ہو تو اس سے ان کی اپنی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اور نہ ہی ان کو اس عصمت کے ثابت کرنے کی کچھ زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ان کا تعلق خود ان کی ذات سے نہیں اور نہ ہی اس کی بابت کوئی خاص حکم موجود ہے۔ قیامت کے دن انسان سے اس کے اپنے اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا۔ جیسا کہ فرمایا:

وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْـتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (النحل: ۹۳)	بیشک تم قیامت کے دن ضرور ان اعمال کے متعلق پوچھے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ذات کے متعلق اکثر بغیر کسی دلیلِ شرعی کے بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو ان کا اصلی فرض ہے یعنی انبیاء علیہم السلام پر سچے دل سے ایمان لانا اور ان کی تعلیم پر عمل پیرا ہونا جو حصولِ سعادت کا حکمی اور تیر بہدف نسخہ ہے، اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ کلامِ مجید میں ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ط وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○	کہہ دو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ لیکن اگر تم نے روگردانی کی تو سمجھ لو کہ بیشک پیغمبر پر اپنی ذمہ داری ہے اور تم پر تمہاری ذمہ داری۔ ہاں اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو سیدھا راستہ پاؤ گے۔ رسول پر تو یہی ذمہ داری

----------	ہے کہ وہ کھلے طور پر اللہ تعالیٰ کا پیغام تم کو پہنچا دے۔
النور: ۵۴	

قصور انبیاؑ اور توبہ الغرض قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کے گناہ اور قصور کا ذکر فرمایا ہے، ساتھ ہی اس کی توبہ و استغفار کا بھی ذکر ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ دعا مشہور ہی ہے کہ:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف: ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو بے شک ہم بہت ہی خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد کہ انہوں نے اپنے کافر بیٹے کی نجات کے لیے سوال کیا، جو ایک غلطی تھی، ان کی یہ دعا نقل کی گئی ہے:

رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (ھود: ۴۷)	ایسی بات کا سوال کیا جس کا مجھے کچھ بھی علم نہیں اور اب اگر تو مجھے نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں زیاں کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔ ----------

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی یہ دعا ملاحظہ ہو:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (ابراہیم: ۴۱)	پروردگار! جس دن حساب کتاب قائم ہو، مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور مومنین کی بھی مغفرت فرما

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے:

اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ	خدایا! تو ہمارا کارساز ہے، تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو ہی سب بخشنے والوں سے افضل ہے۔ اور اس دنیا میں ہمارے لیے نیکی مقرر کر دے اور آخرت میں ہمیں اپنی طرف ہدایت یاب فرما۔
الاعراف: ۱۵۵،۱۵۶	

پھر فرمایا:

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ (القصص: ۱۶)	پروردگارا! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے۔

کوہِ طور پر تجلی الٰہی کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کی:

سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝	خدایا! تیرے ہی لیے ہر طرح کی تقدیس ہے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں یقین رکھنے والوں میں سے پہلا شخص ہوں۔

(الاعراف: ۱۴۳)	

حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں ہے:

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝	اس نے اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کی اور جھک کر رکوع کیا۔ اس کے بعد خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، پس ہم نے اسے بخش دیا اور ہمارے نزدیک اس کے تقرب کی جگہ ہے

(ص: ۲۴)	اور بہتر جائے پناہ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی خطا کا ذکر کرنے کے بعد آپؑ کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ	اے میرے پروردگار مجھے بخش دے اور مجھ کو ایک ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی دوسرے کے لیے سزاوار نہ ہو۔ بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے۔
(ص: ۳۵)	

حضرت یونس علیہ السلام کی دعا تمہارے سامنے ہے کہ:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (الانبیاء: ۸۷)	تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے، مقدس ہے اور بے شک میں ظالموں میں سے ہوں

حضرت یوسف علیہ السلام

هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا | البتہ حضرت یوسف علیہ السلام سے کسی قسم کی برائی اور بے حیائی صادر نہیں ہوئی۔ رہا یہ کہ اس سے پہلے آیا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ	بیشک اس عورت نے یوسفؑ کو قابو میں لانے کا قصد کیا اور اس نے بھی قصد کیا ہی تو تھا اگر وہ رب کی طرف سے ایک روشن دلیل نہ دیکھ لیتا۔ (تو کام خراب تھا)
(یوسف: ۲۴)	

حضرت امام احمد بن حنبل کا قول | امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"اَلْهَمُّ هَمَّانِ هَمُّ خَطَرَاتٍ وَ هَمُّ اِصْرَارٍ

یعنی قصد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات خطرہ کے طور پر دل میں گزر جائے۔ دوسرے یہ کہ کسی فعل کے کرنے کا ارادہ کرے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے کہ:

ان العبد اذا هم بسيئة لم يكتب عليه و اذا تركها لله كتبت له حسنة و ان عملها كتبت له سيئة واحدة	جب آدمی کسی برائی کا صرف قصد کرتا ہے تو وہ لکھی نہیں جاتی (جب تک اس کا ارتکاب نہ کرلے) اور اگر اس کا عمل میں لانا خالص اللہ کے

وان تركها من غير ان	لیے ترک کر دے تو اس کے لیے
تركها لله لم تكتب له	نیکی لکھی جاتی ہے، اگر برائی کا ارتکاب
حسنة ولا تكتب عليه	ہو جائے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی
سيئة	ہے (نیکی کی طرح دس گنا نہیں لکھی
---------------	جاتی) اور اگر اس قصد کو عمل میں نہ لائے
---------------	اور برائی کا ارتکاب نہ کرے لیکن اس
---------------	کا یہ ترک کرنا اللہ (کی خوشنودی حاصل
---------------	کرنے) کے لیے نہ ہو تو نیکی یا برائی کچھ
---------------	بھی نہیں لکھی جاتی۔

قصد اور ترک یوسفؑ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک قصد کیا لیکن اس کا عمل میں لانا خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ترک کر دیا۔ اس خلوص کی بدولت اللہ تعالیٰ نے آپ کو برائی اور بے حیائی سے محفوظ رکھا۔ جیسا کہ آیۃ مذکورہ بالا میں اس کی تشریح ہے۔ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے دل میں بمقتضائے بشریت گناہ کرنے کا خیال سا پیدا ہوا، اس نے اس خیال کو رد کیا اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو برائی کے ارتکاب سے روکا۔ اس لیے ان کا یہ رک جانا ایک نیکی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا صحیح حدیث سے واضح ہوتا ہے۔

ایک غلط روایت لیکن بعض روایات میں جو یہ منقول ہے کہ:

انه حل سراويله وجلس	حضرت یوسفؑ نے سراویل کا بند
مجلس الرجل من المرأة	کھولا اور فعل بد کے ارتکاب کی نیت
وانه رأى صورة يعقوب	سے بیٹھ گئے۔ اس حالت میں آپ
عاضاً على يديه وامثال	کو حضرت یعقوبؑ کی صورت نظر آئی

ذالك	جو اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ
----------------	رہے تھے یا ایسی اور روایتیں۔

اس قسم کی خرافات کا قرآن اور حدیث میں کچھ ذکر نہیں اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایسی باتوں کی خبر دی ہے۔ یہ سب روایتیں یہودیوں سے لی گئی ہیں جو انبیاءً علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حق میں سب سے زیادہ جھوٹ بولتے ہیں اور ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو سراسر ان کی شان اور علو مرتبت کے منافی ہوتی ہیں۔

مفسرین کی غلطی پس اس قسم کا یہ قول بھی ہے جو مسلمانوں نے اہل یہود سے نقل کیا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں ایک حرف بھی نہیں آیا کہ مندرجہ ذیل یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (یوسف: ۵۰)

یہ قول حضرت یوسف علیہ السلام کا ہرگز نہیں، جیسے کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ بلکہ یہ عزیز کی بیوی کا مقولہ ہے۔ اور جس شخص نے اس آیت کے سیاق و سباق پہ غور کیا، اس کو اس میں ذرہ بھی شک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں وہاں حضرت یوسف علیہ السلام موجود ہی نہ تھے بلکہ وہ قید خانے میں تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ۝	بادشاہ نے کہا، یوسفؑ کو فوراً میرے پاس لاؤ۔ لیکن جب (بادشاہ کا) پیغامبر یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور دریافت کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

لیے تھے، جیسی کچھ مکاریاں انہوں نے کی تھیں میرا پروردگار اسے خوب جانتا ہے۔ بادشاہ نے ان عورتوں کو بلا کر پوچھا۔ صاف صاف بتا دو اس وقت تمہیں کیا معاملہ پیش آیا تھا جب تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اسے اپنی طرف مائل کر لو، وہ عورتیں بولیں۔ حاشا اللہ! ہم نے یوسف میں کوئی برائی کی بات نہیں پائی۔ عزیز کی بیوی بھی یہ سن کر بے اختیار بول اٹھی جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہو گئی کہ ہاں میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے کہ اپنا دل ہار بیٹھے۔ بلاشبہ وہ بالکل سچا ہے یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ اسے (یوسف کو) معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے اس کے معاملہ میں خیانت نہیں کی، نیز اس لیے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی کامیابی کی راہ نہیں کھولتا۔ میں اپنے نفس کے تقدس کا دعوے نہیں کرتی۔ ہمارا

----------	نفس تو برائی کے لیے بڑا ہی ابھارنے
----------	والا ہے۔ (اس کے غلبہ سے بچنا
----------	مشکل ہے) مگر ہاں اس حال میں کہ
----------	میرا پروردگار رحم فرما دے بلاشبہ میرا
(یوسف: ۵۰ تا ۵۳)	پروردگار بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔

جب ان کی بارت عورتوں کی شہادت اور خود عزیز کی بیوی کے اعتراف سے ثابت ہوئی تب بادشاہ نے ان کو قید خانے سے نکلوایا اور آپؑ کی تعظیم و توقیر کی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

قَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ	بادشاہ نے حکم دیا، یوسف کو میرے پاس
أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا	لاؤ تاکہ اسے اپنے خاص کاموں کے لیے
كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا	مقرر کروں (پھر جب وہ آئے) ان سے
مَكِينٌ أَمِينٌ ○	ملاقات کی تو کہا: آج کے دن سے تو
----------	ہماری نگاہوں میں بڑا صاحب اقتدار
(یوسف: ۵۴)	اور امانت دار انسان ہے۔

قرآنِ کریم کی آیات کا یہ مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے، اکثر مفسرین کا اس کو یوسف صدیق علیہ السلام کا قول قرار دینا محض بے دلیل اور ایک باطل قول ہے جیسے کہ کسی دوسرے موقع پر اس کی مزید تشریح کی گئی ہے۔

بیانِ افضلیّت و کمال

رجوع الی اللہ کا نتیجہ یہاں پر یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام سے جو گناہ یا قصور سرزد ہوا جب انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کے طالب ہوئے تو ان کا سب گناہ بخشا گیا۔ قصور نیکیوں میں تبدیل ہو گیا اور رفع درجات کا موجب ہوا۔ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد یونسؑ رجوع الی اللہ کے باعث بہت عظیم المرتبت یونسؑ بن گئے۔ کلام پاک میں ہے:

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (ن: ۵۰)	پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا (برگزیدہ بنالیا) اور اپنے نیک بندوں میں داخل فرمایا۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ "انما الاعمال بالخواتیم" (بے شک عملوں کا اعتبار بلحاظ ان کے خاتمہ کے ہے) ہر ایک شخص کا درجہ کمال اس کی آخری حالت کے لحاظ سے تعین کیا جاتا ہے۔ ابتدائے حال کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ انسان کو ابتدائے آفرینش میں جب ماں کے پیٹ سے نکالتا ہے تو وہ علم اور دیگر کمالات سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے۔ پھر بتدریج اس کو درجہ کمال تک پہنچاتا ہے۔ اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ایک کامل مکمل شخص کو اس کی طفلی کا زمانہ یاد دلائے اور اس کو جاہل تصور کرے۔ قبل از توبہ اور بعد از توبہ کی بھی بعینہٖ یہی کیفیت ہے۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی

بعد از تو یہ حالتِ اکمل احوالِ انسانی ہے اور ارتکاب خطاء و تصور کی حالت کو ملحوظ رکھ کر ان کو ناقص یا قابلِ ملامت سمجھنا ایک نہایت ہی غلط خیال ہے۔

ملائکہ کو انبیاء پر فضیلت

غلط فہمی کی وجہ جو لوگ ملائکہ کو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل سمجھتے ہیں ان کو بھی یہی غلط فہمی ہوئی ہے کہ انہوں نے ان کی موجودہ حالت کا ملائکہ کے ساتھ موازنہ کیا۔ اگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ان درجاتِ عالیہ اور اس مقامِ ارجمند کو مدنظر رکھتے، جو جنت الفردوس میں داخل ہو کر ان کو حاصل ہوگا جب کہ وہ ان تمام نقائص اور عیوب سے مبرا ہوں گے جو موجودہ حالتِ بشریہ کا مقتضا ہے اور جب ملائکہ علیہم السلام ہر ایک طرف سے سلام کہتے ہوئے ان کے محلات کے دروازوں سے داخل ہوں گے۔ فرمایا:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (ابراہیم: ۲۳، ۲۴)	اور فرشتے ان پہ ہر دروازے سے داخل ہوتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم پر بسبب صبر کرنے کے سلامتی ہو۔

فضیلتِ کمال باعتبارِ مآل جب ان حالات کا لحاظ رکھا جائے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کون افضل ہے اور مفضول یہ کون؟ مخلوقات میں سے کمال کسے حاصل ہے؟ کیا کسی عقل مند نے اس بات کو بھی سوچا ہے کہ کمال حاصل کرنے سے قبل ان کی اپنی

کیا حالت تھی؟ کیا وہ تمام عیوب و نقائص سے پاک تھے۔ کمالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ آخری حالت کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ ابتدائے خلقت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بھی عام انسانوں کی طرح نطفہ اور مضغہ سے آفرینش ہوئی ہے اور انہوں نے بھی بچپن کے مراحل طے کیے ہیں، اس لیے کمال کے لیے مآل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اسی بنا پر یہ خیال بھی غلط ہے کہ جو شخص مسلمان پیدا ہوا اور عمر بھر میں اس نے کفر نہیں کیا، وہ مطلقاً اس شخص سے افضل ہے جو کافر رہ کر مسلمان ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس کی عاقبت اعلیٰ اور افضل ہے، اسی کو اعلیٰ و افضل سمجھا جائے گا، خلفائے راشدینؓ اور اکثر مہاجرین اور انصار کے سابقینِ اولین جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے، ابتدائے عمر میں کافر تھے اور بعض ان میں سے (مثلاً حضرت عمرؓ) شدید ترین کفار میں سے تھے لیکن آخر عمر میں ان کو وہ مراتبِ عالیہ نصیب ہوئے کہ ان کی اولاد، جن کی پیدائش اسلام پر ہوئی، ان کے گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔

ابن تیمیہؒ کا قول بلکہ میں کہتا ہوں[1]، جس شخص نے ذوق اور وجدان سے شر اور معصیت کو پہچانا ہو، اس کی معرفت اکمل ہے، بمقابلہ اس شخص کے جس نے شر اور معصیت کو صرف نام سے جانا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص صرف خیر و طاعت کو پہچانتا ہے۔ بعض اوقات اس کو ایک ایسا شر پیش آجاتا ہے جس کو وہ نہیں جانتا۔ اس لیے یا تو وہ اس میں گر جاتا ہے یا کم از کم وہ اس کی نظروں میں اتنا مبغوض نہیں ہوتا جتنا کہ اس کو مبغوض ہونا چاہیئے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

انما تنقض عری الاسلام	جب ایک شخص کی اسلام میں

[1] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا قول ہے۔

عروة اذا نشأ فی الاسلام من لم یعرف الجاھلیة	تربیت ہوتی ہے اور وہ جاہلیت کو ذوق و وجدان کے ساتھ نہیں پہچانتا تو بے شک اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی مضبوط کڑیوں کو یکے بعد دیگرے کھول دیتا ہے۔

یہ نہایت سچا قول ہے کیونکہ اسلام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ ہی سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جس شخص نے نیکیوں کے ماحول میں تربیت پائی ہے ۔ اور منکرات سے اس کو واسطہ نہیں پڑا، اس کو منکرات کی کیفیت اور حقیقت کا کماینبغی علم بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کو ان سے احتراز کرنے اور ان کے مرتکبین کو منع کرنے اور ان کے ساتھ جہاد کرنے کے وسائل کا علم ہوتا ہے۔

صحابہؓ کرام کے ایمان اور جہاد کو کیوں تمام دنیا جہان کے ایمان اور جہاد پر فضیلت حاصل ہے؟ اگر کوئی پہاڑ کے برابر بھی نیکی کرے تو وہ نیکی صحابہؓ کی ایک سیر بھر بلکہ پاؤ بھر نیکی کے برابر بھی نہیں ہوتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خیر اور شر دونوں کے عالم تھے ان کی نظروں میں ایمان اور عمل صالح کی قدر تھی اور کفر و معصیت ان کے نزدیک مبغوض ترین چیز تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے مرض اور تنگ دستی کا مزہ چکھا ہے وہ دولت اور صحت کی قدر خوب جانتا ہے اور اس کی لذت کا بھی وہ ٹھیک احساس کر سکتا ہے مشہور ضرب المثل ہے:

الاشیاء تعرف باضدادھا ۔

والضد یظھر حسنة الضد وبضدھا تتبین الاشیاء

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

لست بخب ولا یخدع غنی	مجھے کوئی پوشیدہ بات دھوکے میں
الخب فالقلب السلیم المحمود	نہیں رکھ سکتی۔ پس قابل تعریف
الذی یں ید الخیر لما الشر	قلب سلیم وہ ہے جو نیکی کو پسند کرتا ہو
	برائی کو پسند نہ کرے۔

کمال انسانی یہ ہے کہ نیکی اور برائی کو پہچانے پس جو شخص شر کو نہیں پہچانتا۔ تو یہ کوئی قابل تعریف صفت نہیں، بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک گونہ نقص ہے۔

بنیادِ فضل وکمال بایں ہمہ اس کو ایک قاعدہ کلیہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس نے کفر اور معصیت کا بطور ذوق اور وجدان کے احساس کیا ہے وہ خواہ مخواہ کسی ایسے شخص سے افضل ہوگا جس کو کبھی کفر اور معصیت سے واسطہ نہیں پڑتا کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طبیب جملہ امراض کا عالم ہوتا ہے اور وہ ہر ایک مرض کی حالت اور کیفیت کو مریض سے بہتر جانتا ہے حالانکہ بہت کم امراض ایسے ہوتے ہیں جن کو ذوق اور وجدان اور ذاتی تجربہ کے طور پہ جانتا ہو۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی دراصل روحانی اطباء ہیں اور ان کو تمام امور کا نجوبی علم ہے جو قلوب کی اصلاح یا فساد کا موجب ہو سکتے ہیں، اگرچہ تجربہ اور وجدان کے طور پہ ان کو شرور اور معاصی و ذنوب کا وہ علم نہیں ہوتا جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہے۔

تلخیص مضمون ہماری پہلی تحریر کا ملخص صرف اس قدر ہے کہ بعض اشخاص کو شر اور معصیت کا تجرباتی اور وجدانی علم ہونے سے اس سے وہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس کو ایسا مبغوض سمجھتے ہیں جو بصورت دیگر متصور نہیں، مثلاً ایک شخص مشرک یا یہودی یا عیسائی رہ چکا ہے اور اس کو شبہات اور اعتراضات کا علم ہے جو مخالفین اسلام اس کی حقانیت اور خوبیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے وارد کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو اللہ تعالیٰ حق پہچاننے کی توفیق عنایت فرماتا ہے اور اس کو اسلام کے محاسن اور خوبیاں سمجھا دیتا ہے تو ایسا شخص اکثر اوقات اسلام میں زیادہ راسخ اور

ثابت قدم ہوتا ہے۔ بمقابلہ اس شخص کے جس نے کفر اور اسلام دونوں کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کیا، اس لیے کبھی تو اس کے دل میں اسلام اور کفر کے متعلق محبت اور بغض کا جذبہ بہت کمزور ہوتا ہے اور کبھی وہ اول الذکر کی مدح اور مؤخر الذکر کی مذمت کرنے میں فقط دوسروں کی تقلید کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جس نے بھوک کا مزہ چکھا ہو پھر اس کے بعد سیر ہو کر کھانا کھایا ہو، یا جو بیمار ہوا، پھر اس کے بعد صحت یاب ہوا، یا جس نے خوف کے بعد امن کی حالتوں کو دیکھا ہو۔ پس ان امن و راحت، فقر و فاقہ اور رنج و غم کی سب حالتوں کا اندازہ شناس اس سے بدرجہا بہتر و افضل ہے جو ان کلفتوں اور راحتوں میں مبتلا نہ ہوا ہو۔

اہل بدعت کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنے فسق و فجور کی حالت میں داخل اسلام ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر حق و صداقت کا دروازہ کھول دیا اور وہ تائب ہو گئے انہیں "توبۃ النصوحا" کا مقام حاصل ہوا اور جہاد فی سبیل اللہ کی حقیقت سے شاد کام ہوئے پس ان کا حال، ان کی ہجرت اور ان کا جہاد زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ ان لوگوں سے جنہوں نے ان حالتوں کی چاشنی نہیں چکھی، چنانچہ نعیم بن حماد خزاعیؒ سے منقول ہے کہ:

"میں جہمیہ کے مقابلہ میں اس سے سخت ہوں کہ میں خود پہلے جہمی تھا"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النحل: ۱۱۰)	اور جن لوگوں نے ستائے جانے اور فتنہ سے تنگ آجانے کے بعد ہجرت کی، پھر انہوں نے جہاد کیا اور تکلیفوں کو برداشت کیا، بلاشبہ تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب اور خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو صحابہ کرامؓ میں جو درجہ حاصل تھا، وہ کسی ایسے شخص سے پوشیدہ نہیں جو اسلام کی تاریخ سے واقف ہے۔ ایمان و عملِ صالح کا معاملہ ہو، یا کفار و مشرکین سے جہاد کا کمال ہو، خواہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصرت فرمائی کا۔ خصوصاً حضرت عمرؓ کو تمام مسلمانوں پر (جس میں صحابہؓ بھی شامل ہیں) سوائے ابوبکر صدیقؓ کے تفوق حاصل ہے، کیونکہ وہ مجسمۂ ایمان و اخلاص تھے صداقت و معرفت کے عرفان، اعلیٰ درجہ کے صاحبِ فراست اور سیاستدان تھے ایسا نورِ الٰہی تھے جو ہوائے نفس سے پاک ہو اور اقامتِ دین کے معاملہ میں بلند پایہ اور باہمت سپہ سالار تھے۔

الغرض فضائل اور کمالات کا موازنہ کرتے وقت انتہا اور آخرِ حال کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ ابتدائی حالت کا کچھ لحاظ نہیں رکھنا چاہیئے۔

ساتواں باب

توبہ اور نجاتِ دارین

ذریعۂ محبوبیتِ خداوندی اسرائیلیات میں سے ایک حکایت بیان کی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا:

اما الذنب فقد غفرناہ گناہ تو ہم نے معاف کر دیے لیکن
اما الود فلا یعود دوستی واپس نہیں لوٹ سکتی۔

اگر اس حکایت کی صحت کو درست مان لیا جاتا تو اس کی موجودگی میں ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آوردہ شریعت اور دین کا نام بھی نہ لے سکتے، کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین توبہ کے معاملہ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اگلی تمام شریعتوں میں سے کسی نے بھی اس طرح پیش نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

انا نبی الرحمة و انا نبی التوبة میں رحمت والا نبی ہوں اور میں توبہ والا نبی ہوں۔

بلاشبہ دینِ اسلام نے وہ تمام بندشیں اور رکاوٹیں دور کر دی ہیں جو پہلے مذاہب میں موجود تھیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث منقول ہے:

ان اللہ تعالیٰ یفرح بتوبۃ	بے شک اللہ تعالیٰ کسی توبہ کرنے والے
التائب اعظم من فرح	کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ
الثاید لما یحتاج الیہ من	خوش ہوتا ہے جس کی اونٹنی کھانے
الطعام و الشراب والمرکب	پینے کے سامان سے لدی ہوئی گم
اذا وجدہٗ بعد الیاس	ہو جائے اور وہ اس کی تلاش کر
------------	کے مایوس ہو جائے اور پھر وہ
------------	اچانک اسے مل جائے۔

افضلیت اعمال اب تم خود سمجھ لو کہ جس سے خدائے تعالیٰ محبت رکھتا ہے اور جس سے وہ خوش ہے۔ کیا اس کے گناہ کا کوئی اثر باقی رہ سکتا ہے جس کو فضائل اور کمالات کے موازنہ کے وقت ملحوظ رکھنا لازم ہے؟ بے شک وہ توبہ کے بعد خدائے تعالیٰ کا محبوب ہے جب خوشی اور محبتِ الٰہی کا یہ حال ہے تو کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ:-

اِنَّہٗ لَا یَعُوْدُ لِمَوَدَّتِہٖ — وہ اپنی دوستی کو واپس نہیں لاتا۔

بالفاظِ دیگر توبہ کرنے والا محبتِ الٰہی کھو بیٹھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝	وہ بخشنے والا، دوستی رکھنے والا،
ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۝	بزرگی والا عرش کا مالک ہے جو چاہتا
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝	ہے کرتا ہے۔ (البروج: ۱۴ تا ۱۶)

لیکن اس کی دوستی اور اس کی محبت کی کمی بیشی اس لحاظ سے ہوتی ہے جس لحاظ سے آدمی تقرب الی اللہ حاصل کرتا اور توبہ و انابت کو ذریعہ حصول بناتا ہے اور اگر اس کے وہ اعمالِ صالحہ جو وہ توبہ کے بعد عمل میں لاتا ہے قبل از توبہ کے اعمال سے افضل ہیں تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی بعد از توبہ

کی دوستی قبل از توبہ دوستی سے زیادہ بلند مرتبہ ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو معاملہ خراب ہو جاتا، کیونکہ جزائے اعمال بھی ایک جنس سے ہے اور خدا بندوں کو پورا پورا بدلہ دیتا ہے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اور تیرا رب بے انصافی نہیں کرتا۔

مفصلہ بالا آیت شریفہ اور حدیث کو پڑھ کر اس حدیث قدسی کا مضمون بھی ملحوظ رکھنا لازم ہے جو صحاح میں منقول ہے:

مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ	جو شخص میرے کسی دوست کو دشمن
اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا	سمجھتا ہے تو یقیناً میری طرف سے
تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِمِثْلِ	اسے اعلانِ جنگ ہے۔ میرا بندہ
اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَ	ان فرائض کی ادائیگی سے میرا قرب
لَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ	نہیں پاتا بلکہ میرے قرب کے لیے
اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ	کثرتِ نوافل کا شغل اختیار کرتا ہے
فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهٗ	حتٰی کہ مجھے اس سے محبت ہوجاتی
الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهٗ	ہے، پھر میں اس کے کان بن جاتا
الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهٗ	ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس
الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهٗ	کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ
الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا فَبِيْ يَسْمَعُ	دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں
وَبِيْ يُبْصِرُ وَبِيْ يَبْطِشُ	جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے
وَبِيْ يَمْشِيْ وَلَئِنْ سَاَلَنِيْ	پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا
لَاُعْطِيَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ	ہے۔ پس وہ مجھ ہی سے سنتا اور مجھ
لَاُعِيْذَنَّهٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ	ہی سے دیکھتا اور مجھ ہی سے پکڑتا اور
فِيْ شَيْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِيْ فِيْ	مجھ ہی سے چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے

تَبْعِضُ نَفْسِيْ عَبْدِیْ الْمُؤْمِنُ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَکْرَہُ مَسَاءَ تَہٗ وَلَا بُدَّ لَہٗ مِنْہُ	سوال کرے تو میں ضرور پورا کرتا ہوں اور اگر میری پناہ چاہے تو اسے پناہ دیتا ہوں اور جو کچھ میں چاہتا ہوں، کر لیتا ہوں کیونکہ میرا چاہنا میرے اپنے قبضہ میں ہے۔ میرا بندہ موت سے کراہت کرتا ہے اور میں اس کی برائی ناپسند کرتا ہوں اور یہ اس کے لیے ضروری ہے۔

افضل بعد از انبیاء یہ بھی معلوم ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل ترین لوگ مہاجر اور انصار ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے اور اپنے پروردگار سے محبت اور دوستی کا دم بھرتے تھے اور وہ بھی قبل از اسلام کفر و فسق، عصیان و طغیان سے توبہ کے بعد اس مقام عالی پر فائز ہوئے تھے۔ ان کی دوستی اور محبت کا یہ تقرب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعے حاصل ہوا، اس طرح وہ خدا کے محبوب و مقبول اور دوست اور محب صادق بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَ اللّٰهُ قَدِيْرٌ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الممتحنہ: ۷)	عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو تمہارے ساتھ عداوت رکھتے ہیں، آپس کی الفت پیدا کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت ان مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے جنگِ احزاب میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ دشمنی کی تھی۔ جیسے ابو سفیانؓ بن حرب، ابو سفیان

بن حرث، حرث بن ہشام، سہیل بن عمر، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن امیہ وغیرہ، پھر انہی لوگوں نے اپنی دشمنی کے بعد رسول اللہ اور مسلمانوں سے خدا کو درمیان میں لاکر دوستی کا عہد و پیمان باندھا تھا اور یہی ان کی فضیلت کی وجہ ہے۔ پھر عکرمہ، سہیل، حرث بن ہشام، تینوں کی دوستی ابوسفیان کی دوستی سے بھی افضل ہے۔ نیز صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ:

ان هند امرأة ابی سفیان ام معاویة قالت ورالله یا رسول الله ما کان علی وجه الارض اهل خباء احب الی ان یذلوا من اهل خباءك وقد اصبحت وما علی وجه الارض اهل خباء احب الی ان یعزوا من اهل خباءك فذکر النبی صلی الله علیه وسلم نحو ذلك	ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے کہا جو معاویہؓ کی ماں تھی، خدا کی قسم اے اللہ کے رسولؐ! روئے زمین پر کوئی بھی گھرانہ نہیں تھا جو مجھے زیادہ محبوب ہو اگرچہ وہ ذلیل ہوں، آپ کے گھرانہ سے اور اب میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ روئے زمین پر کوئی گھرانہ نہیں جسے زیادہ محبوب جانوں، اگرچہ وہ زیادہ معزز ہوں آپ کے گھرانہ سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی بیان فرمایا۔

نیز یہ مسلمہ امر ہے کہ مومنوں کی محبت اور دوستی، اللہ کی محبت کے تابع ہے کیونکہ موثق ترین ایمان الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ پس اللہ کیلئے محبت کمالِ توحید سے ہوتی ہے اور اللہ کی سی محبت کرنا شرک ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا	انسانوں میں سے کچھ انسان ایسے بھی ہیں جو خدا کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ : ۱۶۵)	کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں جنہیں وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیئے۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ محبوب اللہ کو سمجھتے ہیں۔

دوستی اور دشمنی کا اصول یہی دوستی رسولؐ اور مومنوں کے مابین ہوتی اور ان مشرکین کے درمیان بھی ہوتی جنہوں نے ان کے ساتھ دشمنی کی ہوتی۔ حقیقی دوستی اور محبت وہی ہے جو صرف اللہ کے لیے ہو۔ جو اللہ کو محبوب جانتا ہے اللہ اسے خوب محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ کو دوست بناتا ہے، اللہ اسے دوست بنا لیتا ہے۔

پس جان لو کہ توبہ کے بعد اللہ انہیں اس طرح محبوب اور دوست بنا لیتا ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ توبہ کرنے والا بخشش تو حاصل کر لیتا ہے مگر دوستی حاصل نہیں کرتا۔

اگر سائل کا یہ اعتراض ہو کہ کافر ہونے کی وجہ سے وہ یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ فعلِ حرام ہے۔ بلکہ وہ تو جاہل تھے، اس لیے نادانستہ ایک حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔ اس کا جواب دو طرح پر ہے:

اوّل تو یہ بات غلط ہے کہ انہوں نے نادانستہ ارتکابِ حرام کیا ہو کیونکہ اکثر کافر بھی جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور حسد و تکبر کی بنا پر آپؐ سے دشمنی کرتے تھے جیسے مثلاً ابوسفیانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی خبریں عامِ یرموک میں امیہ بن ابوصلت اور ہرقل بادشاہِ روم سے سنی تھیں پھر بھی وہ اسلام کے بہی خواہ نہ تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے بہت بڑی دشمنی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ مشرف باسلام ہوا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (الفرقان: ۶۸ تا ۷۰)	جو لوگ اللہ کے ہمراہ کسی دوسرے معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس جان کو مارنا حرام کر دیا ہے اسے نہیں مارتے مگر حق کے ساتھ اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں جو شخص ایسا کرے گا وہ سخت عذاب پائے گا۔ قیامت کے دن اسے عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور وہ ذلیل ہو کر اس میں ہمیشہ رہے گا مگر جو شخص توبہ کر لے اور نیک کام کرے یہی لوگ ہیں جن کے گناہ نیکیوں سے بدل دے گا۔

پس نیکیاں ہی ہیں جو ان کے لیے اللہ کی دوستی کا موجب ہوئیں اور برائیوں کو نیکیوں سے بدلنا ان لوگوں کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہے جو کافر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب کی توبہ کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ --------------- (النساء: ۱۷)	اللہ کے حضور توبہ کی قبولیت انہی لوگوں کے لیے ہے جو برائی کی کوئی بات نادانی و بے خبری سے کر بیٹھتے ہیں تو پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں تو ایسے ہی لوگ ہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جانتا حکمت والا ہے۔

حضرت ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ میں نے صحابہؓ سے اس آیت کریمہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا جس کسی نے اللہ کی نافرمانی کی وہ جاہل ہے اور جس کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کرلی تو اس کی توبہ عنقریب قبول ہوگی۔

معیارِ محبوبِ اللہ دوسرے دونوں قسم کی توبہ کے درمیان جو فرق کیا جاتا ہے خواہ گنہگار کی توبہ ہو یا مطلق توبہ۔ تو اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے خواہ وہ جانتے ہوں کہ وہ گنہگار ہیں یا نہ جانتے ہوں۔ اس لیے جو شخص اپنے کو مجرم گردان کر توبہ کرے گا تو ضروری ہے کہ اس کی مذموم صفت، محمود سے بدل دی جائے، یعنی اگر وہ حق کو مبغوض جانتا تھا تو وہ اسے محبوب جاننے لگے گا اور اگر باطل چیز سے محبت کرتا تھا تو وہ اسے ناپسند کرنے لگ جائے گا۔ پس اس طرح توبہ کرنے والے کو معرفتِ حق حاصل ہوگی۔ حق کو اچھا سمجھ کر اس پر کاربند ہو جائے گا اور باطل کو برا جان کر اس سے اجتناب کرے گا۔ سو یہی باتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند فرماتا، ان سے خوش ہوتا اور محبت کرتا ہے۔ اس طرح جس بندے کا بھی جو کام محبوبیتِ حق میں جس قدر عظیم ہوگا، حق تعالیٰ بھی اسی قدر عظیم محبت سے پیش آئے گا اور اسے مکروہات سے پھیر کر پسندیدہ کاموں کی طرف منتقل کر دے گا اور ساتھ ہی وہ اس قوت کے ساتھ جس سے وہ باطل کو مبغوض جانے گا۔ خدا کی پسندیدہ چیزوں کو محبوب سمجھنے لگ جائے گا۔ پس یہ محبت حق کی زیادتی کا موجب ہوگی اور اس کی دوستی سے بہرہ مند ہونے کی بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکیوں سے اس لیے بدل ڈالے گا کہ اس نے اپنی مذموم صفات کو محمود اور قابلِ تعریف بنالیا ہے۔

جزائے اعمال بھی چونکہ ایک جنس ہے اور جب توبہ کرنے والا خدا کی پسندیدہ چیزوں کا راس المال بہ نسبت دوسروں کے زیادہ لے کر آئے گا تو خدا کی محبت بھی عظیم ترین ہوگی اور جب اس کے کام جن کو اللہ دوست رکھتا ہے توبہ قبول کرنے سے پہلے

کاموں سے زیادہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بھی توبہ کرنے کے بعد اس سے زیادہ دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا، پھر یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ :۔

المودۃ لا یعود | خدا کی دوستی حاصل نہیں ہوتی۔

الغرض یہ کہنا جیسے کہ بعض اسرائیلیات سے منقول ہے "کہ توبہ کرنے سے مغفرت تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن خدا کی دوستی حاصل نہیں ہوتی اور اس کی محبت سے انسان محروم رہتا ہے"، ایک سراسر لغو اور باطل قول ہے۔

اہلِ تشیع کے عقیدے کی تردید

قبل از نبوّت معصومیٔ انبیاءؑ اس تقریر سے ان لوگوں کے شبہہ کا جواب ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ نبوت سے پہلے بھی وہ گناہوں سے معصوم ہو۔ جیساکہ بعض اہلِ تشیع کا اعتقاد ہے اور اسی طرح جس نے کہاکہ ہر نبی کے لیے ضروری ہے کہ نبوت سے پہلے بھی مومن ہو کیونکہ ان لوگوں کو یہی غلط فہمی ہے کہ کسی گناہ کا صادر ہونا ہمیشہ کے لیے اس کے مرتکب کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جاتا ہے۔ چاہے اس نے اس سے توبہ کرلی ہو لیکن ہم نے تم پر ثابت کر دیا ہے کہ سچی توبہ کے بعد آدمی خدائے تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور گذشتہ افعال سے اس کی تنقیص نہیں کی جاسکتی اور جو لوگ اس کو نقص خیال کرتے ہیں وہ بھاری غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جو مذمت اور عقوبت کسی گناہ کا نتیجہ ہو سکتی ہے، وہ اس شخص کے لیے ہرگز نہیں جو اس سے تائب ہو چکا ہے۔

تاخیر و توقف قابلِ پاداش البتہ اگر گناہ صادر ہونے کے بعد توبہ میں تاخیر کی جائے اور توقف سے کے مناسب حال سزا کا وہ مستوجب ہوگا لیکن انبیاء علیہم السلام نے کبھی توبہ میں تاخیر نہیں کی اور اگر بالفرض کسی نے کچھ تاخیر کی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً اس کو آزمائش میں ڈالا جس سے اس کا کفارہ ہوگیا۔ چنانچہ ذی النون (یونس علیہ السلام) کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ نبوت کے بعد یہ واقعہ پیش آیا اور جو شخص کہتا ہے کہ قبل از نبوت کا واقعہ ہے تو یہ بات چنداں قابلِ التفات نہیں، کیونکہ کفر و ذنوب سے توبہ کرنے والے بہرحال ان لوگوں سے افضل ہیں جو سرے سے کفر و ذنوب میں ملوث نہیں ہوئے۔ جب ان کی فضیلت متحقق ہوگئی تو ضروری ہے کہ فضیلت والے نبوت کے زیادہ حقدار ٹھہریں۔

ابطالِ عقیدۂ باطلہ بہر کیف قرآن کریم کے نصوص اس قول کو باطل قرار دیتے ہیں کہ توبہ کے بعد بھی انسان اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم رہتا ہے مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں پڑھو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ آپؑ کے بھائیوں نے آپؑ کے ساتھ کیا کچھ کیا اور کن کن گناہوں کے وہ مرتکب ہوئے لیکن بایں ہمہ اسباطِ یعقوب علیہ السلام کا نبی ہونا قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔ خود حضرت یوسف علیہ السلام توبہ کے بعد ان سے اس طرح مخاطب ہوئے کہ:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ | آج تم پر کچھ ملامت نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا بیان فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ (العنکبوت: ۲۶)	پس ان پر لوط ایمان لے آئے اور کہا بے شک میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔

جس کے بعد اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو اپنی

قوم کی طرف پیغمبر بنا کے بھیجا اور ان کی پیغمبری کا قصہ کئی جگہ قرآن کریم میں مذکور ہے۔
حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے کے اثناء میں آتا ہے:

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ---------- ---------- الاعراف: ۸۸، ۸۹	شعیب علیہ السلام کی قوم کے گردن کشوں نے کہا، اے شعیب ہم تم کو اور جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو بھی اپنی بستی سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے کہا اگر ہم تمہارے دین سے متنفر بھی ہوں، تب بھی؟ جب اللہ نے ہمیں تمہارے باطل مذہب سے نجات بخشی ہے تو اگر اب ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری طرف لوٹیں مگر جو کچھ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر ایک چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ ہمیں اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کھول دے۔ اور تو بہتر کھولنے والا ہے (حق کا)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ (الرعد ۱۳، ۱۴)	منکروں نے اپنے رسولوں سے کہا ہم تمہیں اپنے ملک سے ضرور نکال باہر کریں گے۔ یا پھر تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ ہم نے رسولوں پر وحی بھیجی اب ہم ان ظالموں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور ان کے بعد تمہیں اس سرزمین میں جگہ دیں گے۔ یہ اس کے لیے ہے جو ہماری حکومت سے ڈرا اور ہماری وعید سے خائف ہوا

الغرض گناہ صادر ہو جانے کے بعد تائب ہوتا تنقیص کا موجب نہیں بلکہ توبہ بھی منجملہ دیگر فضائل اور کمالات کے ایک فضیلت اور کمال ہے۔

بلا استثناء فرضیّت توبہ

حصولِ کمال کا ذریعہ ہر ایک شخص پر توبہ فرض کی گئی ہے کیونکہ توبہ ہی اس کے لیے حصولِ کمال کا ذریعہ ہے۔ کلام مجید میں ہے:۔

اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَہُوْلًا ۙ لِّیُعَذِّبَ اللّٰہُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ الْمُشْرِکٰتِ وَ یَتُوْبَ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (الاحزاب: ۷۳)	بے شک نوعِ انسانی بہت ظالم اور جاہل ہے اس کا انجام اور نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے گا، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر ان کی توبہ کی وجہ سے رحمت کے ساتھ رجوع فرمائے گا اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بالفاظِ دیگر نوعِ انسانی کے ہر ایک فرد کا کمال اس میں ہے کہ وہ تائب ہو، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہو گا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَ تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا	مومنو! تم سب اللہ کی طرف رجوع

اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (النور:۳۱)	کرو (اس کی بارگاہ میں تائب ہو جاؤ) تب یہ امید رکھو کہ تم کامیاب ہو گے۔

موردِ عنایتِ الٰہی اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس بات کی خبر دی ہے کہ آدم اور نوح علیہما السلام اور دیگر انبیائے عظام حتیٰ کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کی اور موردِ عنایات ہوئے۔ سب سے آخر میں جو آیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:-

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا	جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور فتح مندی کا ظہور ہوگا اور تم دیکھو گے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں
----------------	تو تم اللہ تعالیٰ کی پاکی اور اس کی حمد بیان کرو اور اس سے مغفرت طلب
----------------	کرو بے شک وہ توبہ قبول کرنے
(النصر: ۱تا۳)	والا اور رجوع کرنے والا ہے۔

اسوۂ نبیؐ صحیحین میں حضرت، عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد آپؐ اکثر رکوع و سجود میں یہ الفاظ دہرایا کرتے تھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ	پاک ہے تو اے اللہ ہمارے پروردگار! اور تیرے لیے ہی سب تعریف
----------------	ہے۔ یا اللہ! مجھے بخش دے۔

یہ قرآنِ کریم کی تاویل ہے اور اس سے قبل فرمایا ہے:-

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ : ۱۱۷)	بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور ان مہاجرین وانصار کی توبہ قبول فرمائی جنہوں نے تنگی کے وقت میں آپ کا ساتھ دیا۔ ان کے توبہ کرنے اور پھر ان کی توبہ مقبول ہونے سے پیشتر قریب تھا کہ ان میں سے ایک فریق کے دل راہ راست سے منحرف ہوں۔ اس حالت کے بعد اللہ نے ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمایا اور ان کی توبہ قبول کی۔ بیشک وہ ان پر نہایت ہی مہربان ہے۔

ستر بار سے زیادہ مرتبہ توبہ[70] صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ رَبِّكُمْ فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً	لوگو! اللہ کی طرف رجوع کرو اور تائب ہو جاؤ۔ مجھے اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ بے شک میں دن بھر میں ستر سے بھی زیادہ مرتبہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس کی بارگاہ میں تائب ہوتا ہوں۔

استغفار کی دُعائیں

سو سو بار توبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ:

انی لیغان علی قلبی و انی لاستغفر اللہ فی الیوم مائۃ مرۃ	بے شک میرا قلب گاتلہے اور دن میں سو بار اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔

سنن میں ابو عمرؓ سے منقول ہے کہ ہم گنتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی مجلس میں مندرجہ ذیل کلمات سو بار کہے:

رب اغفر لی و تب علیّ انك انت التواب الغفور	میرے پروردگار مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔ بیشک تو بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بخشنے والا ہے۔

قومۂ نماز کی دعا صحیحین میں ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ وَجَهْلِيْ وَ اِسْرَافِيْ فِيْ اَمْرِيْ وَ مَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ	یا اللہ! میری خطاؤں، میری نادانی، اور میرے کاموں میں میرا اسراف اور جو میرے عیوب تجھ پر ظاہر ہیں سب معاف فرما دے۔ یا اللہ میری

هَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطَائِیْ وَعَمَدِیْ وَکُلُّ ذٰلِکَ عِنْدِیْ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِہٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ	ہزلیات اور میری قصداً خطائیں اور بھول چوک اور ایسی ہی میری اور غلطیاں بخش دے، یا اللہ میری مقدم و مؤخر اور پوشیدہ اور علانیہ کی خطائیں اور جو کچھ عیوب تو میرے متعلق جانتا ہے، سب معاف فرما دے، تو ہی مقدم اور تو ہی مؤخر ہے اور تو ہی ہر طرح کی سب باتوں پر قادر ہے۔

تکبیر تحریمہ اور قراءۃ کی درمیانی دعا صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا، یارسول اللہ! تکبیر اور قراءۃ کے درمیان خاموش رہ کر آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، میں یہ دعا پڑھتا ہوں:

اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ	بار خدایا! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ڈال دے۔ بار خدایا! مجھے گناہوں سے اس طرح پاکیزہ بنا دے جیسے سفید کپڑے کو میل کچیل سے اجلا کر لیا جاتا ہے۔ بار خدایا! میرے گناہوں کو رحمت کے پانی اور برف اور اولوں سے دھو ڈال۔

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے کہ آپؐ رکوع سے سر اٹھا کر بھی یہی الفاظ زبان پہ لاتے تھے۔

آغازِ نماز کی دُعا | نیز صحیح مسلم میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے شروع میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ رَبِّیْ وَ اَنَا عَبْدُكَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ عَمِلْتُ سُوْٓءً فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَ اصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا فَاِنَّهٗ لَا یَصْرِفُ عَنِّیْ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ	بارخدایا! تو بادشاہ ہے۔ تیرے بغیر کوئی اور معبود نہیں، تو میرا پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ ہوں۔ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور برائیاں کیں بے شک سوائے تیرے اور کوئی گناہوں کا بخشنے والا نہیں۔ بارخدایا! مجھ کو بہترین اخلاق واعمال کی ہدایت فرما۔ سوائے تیرے اور کوئی یہ ہدایت دینے والا نہیں اور برے اخلاق واعمال مجھ سے دُور رکھ بیشک تیرے سوا اور کوئی مجھ کو ان سے دور نہیں رکھ سکتا۔

سجدے کی دُعا | اسی طرح صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں کہا کرتے تھے کہ:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ کُلَّهٗ دِقَّهٗ وَ جِلَّهٗ وَ عَلَانِیَتَهٗ وَ سِرَّهٗ وَ اَوَّلَهٗ وَ اٰخِرَهٗ	بارخدایا! میرے تمام چھوٹے اور بڑے ظاہر اور پوشیدہ، اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔

سواری کی دُعا تلقین | سنن کی کتابوں میں حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب سواری لائی گئی تو آپؐ نے اللہ تعالےٰ کی تعریف کی اور یہ آیت پڑھی:

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (زخرف: ۱۴)	پاک ہے وہ خدا جس نے اس قسم کی سواری کو ہمارے لیے مسخر کیا، حالانکہ ہم ان کے مقابلے کے نہیں تھے۔ اور بیشک ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پھر تکبیر کہہ کر حمد کے الفاظ زبان پر لائے اور فرمایا:

سُبْحَانَكَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّاۤ اَنْتَ	تو پاک ہے میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ مجھ کو بخش دے بے شک تیرے سوا کوئی اور گناہوں کی مغفرت نہیں فرماتا۔

پھر آپ نے ہنس دیا اور فرمایا:

اِنَّ الرَّبَّ یُعْجَبُ مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا قَالَ اغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّاۤ اَنْتَ	بے شک پروردگارِ عالم اپنے بندے پر تعجب کرتا ہے جب وہ کہتا ہے، خدایا مجھے بخش دے، کیونکہ تیرے سوا گناہوں کا بخشنے والا کوئی نہیں۔

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں مخاطب فرمایا:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ	تم اپنے گناہوں کے لیے اور دیگر مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے مغفرت طلب کرو۔

قرآن شریف میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا	بے شک ہم نے تم کو نمایاں فتح دی

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ	عنایت کی اور بالآخر اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہوں کو بخش دے گا

صحاح میں روایت شفاعت میں ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی امت کو جب وہ ان کے پاس شفاعت کی غرض سے حاضر ہوں گے تو فرمائیں گے :۔

اِذْهَبُوْا اِلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدٍ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَا تَأَخَّرَ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اللہ تعالیٰ نے ان کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں

دوسری حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر لمبا قیام فرماتے تھے کہ آپؐ کے دونوں قدم مبارک متورم ہو جاتے ۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ آپ اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا :

افلا اکون عبدا شکورا ----------------	کیا میں اللہ تعالےٰ کا شکر گزار بندہ نہ بن جاؤں ۔

مفسرین کی غلط تاویلیں

فرقہ جہمیہ و باطنیہ کی توجیہ الغرض کہاں تک قرآن اور حدیث کے حوالے بیان کیے جائیں اور صحابہ و تابعین اور علمائے سلف کے اقوال سنائے جائیں لیکن جو لوگ بزعم خود انبیاء علیہم السلام سے گناہ صادر ہونے کو ان کے لیے کسرِ شان خیال کرتے ہیں۔ وہ ان نصوص کی اسی طرح تاویلیں کرتے ہیں، جس طرح جہمیہ اور باطنیہ نے اسماء اور صفاتِ الٰہیہ تعالیٰ شانہٗ کے حقائق سے انکار کرنے کے لیے گھڑلی ہیں جن کو تاویل کے بجائے تحریف کہنا انسب معلوم ہوتا ہے۔

غلط توجیہ کی ایک مثال مشتے نمونہ از خروارے وہ یہ کہتے ہیں کہ:

"مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ سے آدم علیہ السلام کی لغزش مراد ہے اور وَمَا تَأَخَّرَ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تمہاری امت کے گناہ بخش دیں گے۔"

یہ توجیہ بالکل غلط ہے اور اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

وجوہاتِ سبعہ یہ آیت بالاتفاق مفسرین و اہل حدیث صلح حدیبیہ کے موقع پر

(۱) نازل ہوئی ہے لیکن آدم علیہ السلام کا گناہ تو ان کے زمین پر آنے سے پہلے ہی بخشا جا چکا تھا اور ان کی توبہ قبول ہو چکی تھی جیسے کہ قرآن شریف میں مختلف جگہوں پر یہ قصہ پڑھنے سے واضح ہو جاتا ہے، فرمایا:

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ | آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی سے

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰی (طٰهٰ : ۱۲۱، ۱۲۲)	نافرمانی کی تو وہ بے راہ ہو گیا، پھر اس کے پروردگار نے اسے برگزیدہ کیا، اس کی توبہ قبول کی اور وہ ہدایت یاب ہوا

دوسری جگہ ہے:

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (البقرہ: ۳۷)	پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے چند کلمے سیکھے۔ اللہ نے اس کی توبہ قبول کرلی وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

اور قرآن نے بیان کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے یہ دعا کی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (الاعراف: ۲۳)	اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ فرمائے گا تو ہم ضرور زیاں کاروں میں سے ہو جائیں گے۔

(۲) علاوہ ازیں آدم علیہ السلام بھی تو نبی ہیں اور جو لوگ عصمتِ انبیاءؑ کے ان معنوں میں قائل ہیں کہ ان سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا اور اس بارے میں آدم اور محمد علیہما الصلوٰۃ میں کوئی فرق نہیں کرتے اس لیے ان کی اس توجیہ کو ماننے ہوئے بھی دلیل کا زور قائم رہتا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے متعدد آیتیں نازل فرما کر اپنا اٹل قانون یہ بتایا ہے کہ:

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی	کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ آدم علیہ السلام یا آپؐ کی امت کے گناہوں کو کیوں

آپ کی طرف منسوب کیا جائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ (النور: ۵۴)	اس چیز کا بوجھ اسی پر ہے جس نے اسے اٹھایا اور تم پر اس کا بوجھ ہوگا جو تم اٹھائے گئے۔

اور پھر فرمایا:

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ	اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرو۔ تم اپنے نفس کے ہی ذمہ دار ہو۔

اگر کسی دوسرے کے گناہ کی ذمہ داری دوسرے پر عائد کرنا جائز ہوتا تو پھر یہ بھی جائز ہوتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کے سب کے سب گناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے جا سکیں تو پھر کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ	اللہ تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے۔

آپؐ سے قبل تمام نبیوں اور ان کی امتوں کے گناہوں کا جو بیان ہے تو دراصل اس سے مراد قیامت کا دن ہے جو آپؐ سب مخلوقات کے لیے شفاعت کریں گے آپؐ بنی نوع انسان کے سردار ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا:

انا سيد ولد ادم ولا فخر ادم فمن دونه تحت لوائي يوم القيامة انا خطيب الانبياء اذا وفدوا وانا مبشرهم اذا اجتمعوا	قیامت کے دن میں بنی نوع انسان کا سردار ہوں گا اور مجھے اس پر فخر نہیں حضرت آدم بھی میرے جھنڈے تلے ہوں گے میں تمام نبیوں کا خطیب ہوں گا جب وہ وفد کی شکل میں خدا

----------------	کے حضور حاضر ہوں گے اور ان کا امام
----------------	ہوں گا۔ جب وہ سب جمع ہوں گے۔

پس اس طرح حضرت آدمؑ کے گناہ کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ وہ تو اولین و آخرین سب کے گناہ آپ کے ذمہ لگاتے ہیں اور اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام امتوں کے گناہ نہیں بخشے گا تو وہ کہیں گے کہ آپؐ کی تمام امت کے گناہ بھی نہ بخشے گا۔

(۴) اس آیت سے :

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (محمدؐ : ۱۹)	اپنے اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔

واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا گناہ امت کا گناہ نہیں اور نہ ہی امت کے گناہ آپؐ کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں ورنہ صرف وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ کہنا کافی ہوتا۔ پھر ایک مومن کا گناہ کس طرح آپؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے ؟

(۵) صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی :

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ	اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے۔

تو صحابہ کرام نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا، "یہ تو آپ کے لیے اور ہمارے لیے؟" اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي	اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومن مرد اور عورتوں کو جنت کے باغوں میں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الفتح: ۵)	داخل فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

اور فرمایا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ	اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں اطمینان اور سکینت آتارتا ہے تاکہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو۔ (الفتح: ۴)

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جانتے تھے کہ لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ کی آیت آپؐ ہی کے لیے ہے اور امت اس کے مفہوم میں داخل نہیں۔

(۶) یہ ایک یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امت کے گناہ نہیں بخشے ہیں، لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ مَا تَاَخَّرَ سے آپؐ کی امت کے گناہ مراد ہیں کیوں کہ آپؐ کی امت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کو دنیا ہی کی زندگی میں اور نیز آخرت میں ان کے گناہوں پر مواخذہ اور عذاب ہوتا ہے اور ہوگا۔ صادقِ مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بابت خبر دی ہے اور ائمہ سلف کا اس پر اتفاق ہے اور اس قسم کے واقعات روزمرہ دنیا میں مشاہدہ کیے جاتے ہیں۔ جن کا شمار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا، جیسے اس نے کلام مجید میں فرمایا ہے:

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ	اللہ تعالیٰ کے احکام اور قوانین نہ تو تمہاری (مسلمانوں کی) آرزوؤں کے تابع ہیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں

لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ۝ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۝	پر کچھ منحصر ہے ۔ خدا تعالیٰ کا اٹل قانون تو یہ ہے ، جس شخص نے کچھ بھی برائی کی وہ اس کی سزا بھگتے گا اور اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی بھی اس کا دوست اور مددگار نہیں ہوگا لیکن جس کسی نے نیکیاں کیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو بے شک یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۔
(النساء : ۱۲۳ ، ۱۲۴)	

(۷) اس آیت کے مضمون سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استغفار اور توبہ ترکِ افضل پر کی جاتی ہے ۔ جو شخص فضیلت کا درجہ حاصل کرتا ہے وہ اپنی پہلی حالت سے یقیناً تائب ہوتا ہے لیکن مذمت اور وعید صرف گناہوں کے سرزد ہونے پر کی جاتی ہے ۔

مقبولیّت توبہ اور اعترافِ گناہ

مومن موحد کی مغفرت سائل نے اپنے استفسار میں یہ بھی دریافت کیا ہے کہ کیا توبہ کی مقبولیت اور گناہوں کی بخشش اور جو پاداش اور تکلیف گناہوں کی وجہ سے صادر ہو چکی ہے، اسے دور کرنے کے لیے صرف گناہ کا اعتراف کر لینا ہی کافی ہے یا کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص موحد ہے تو مامور بہ کے طور پر توبہ کر لینا اس کے لیے ہر ایک گناہ کی مغفرت کا موجب ہے۔

ناقابلِ بخشش گناہ ساتھ ہی یہ تفصیل بھی یاد رکھو کہ شرک کو بغیر توبہ کے اللہ تعالےٰ کبھی نہیں بخشتا اور اس سے کم درجہ کے دوسرے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ سورۂ نساء میں دو جگہ یہ آیت آئی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۴۸، ۱۱۶)	بے شک اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرماتا اور اس سے کم تر درجہ کے ہر ایک گناہ کو اگر چاہے تو بخش دے۔

ان آیتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شرک سے کم تر درجہ کے گناہ بغیر توبہ کے بھی بخشے جائیں گے لیکن ان کی مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مشروط ہے

لہ سوال نمبر ۹ کا جواب یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

البتہ توبہ کے ساتھ سب گناہ شرک اور غیر شرک بخشے جاتے ہیں۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (الزمر: ۵۳، ۵۴)	کہہ دو! اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس مت ہونا۔ بےشک اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے اور تم کو چاہیے کہ اپنے رب کی طرف رجوع کرو (تائب ہو جاؤ) اور اس کے مطیع ہو جاؤ پیشتر اس کے کہ تم پر عذاب نازل ہو کیونکہ پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

یہاں چونکہ توبہ کے ذریعہ گناہوں کا بخشا جانا مقصود ہے اس لیے تعمیم کی تاکید فرمائی ہے تاکہ شرک اور غیر شرک سب گناہوں کو شامل ہو۔

مشرک و موحد ایک دوسری جگہ بھی توبہ کے بعد شرک اور کفر بخشے جانے کی تصریح فرمائی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: ۳۸)	ان لوگوں سے کہہ دو جنہوں نے کفر اختیار کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ ان کو بخش دیا جائے گا۔

الغرض ایک موحد شخص جو گناہ کا اعتراف کرتا ہے اگر اس کا یہ اعتراف توبہ کی شروط پر مشتمل ہے تو یقیناً اس کے گناہ بخشے جائیں گے جب گناہ بخشے گئے

تو عقوبت بھی ٹل جاتی ہے کیونکہ مغفرت کے معنی ہی گناہوں کی برائی سے بچانا ہے تاکہ گناہوں کی عقوبت نہ جھیلنی پڑے اور سزا نہ ملے۔

معانی لفظِ مغفرت بعض علماء کا قول ہے کہ مغفرت کے معنی پردہ پوشی کے ہیں، اس لیے اس کا نام مغفرت رکھا، لیکن غفار کے معنی ہیں۔ گناہوں پہ پردہ ڈالنے والا" اس سے مغفرت کا پورا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ کا اسم حسنیٰ غفار ہے۔ کیونکہ وہ ستار ہے کہ پردہ پوشی کرتا ہے اور یہ مغفرت کے معنوں کی تفسیر ہے۔ کیوں کہ مغفرت کے معانی گناہ کے شر سے اس طرح بچائے جانے کے ہیں کہ ان پر عقوبت نہ ہو تو جس کے گناہ بخشے گئے اسے عذاب نہ ہوگا، لیکن ستر یعنی پردہ ڈالنے کی حالت میں یہ ممکن ہے کہ در پردہ باطن میں اس پر عقاب یا عتاب نازل ہو جس کے بالفاظِ دیگر یہ معنی ہیں کہ گناہ کا اثر زائل نہیں ہوا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ باوجود مغفرت کے کسی کو آزمائش میں ڈالا جائے تاکہ اس کے لیے اجر اور ثواب کی زیادتی کا موجب ہو۔ یہ مغفرت کے منافی نہیں۔

اسی طرح بعض گناہوں کے پورے طور پر بخشے جانے کے لیے خاص نیکیوں کا بجالانا ضروری ہوتا ہے۔ یہ توبہ کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی طرح ہم نے مغفرت کے لیے اعتراف کے ساتھ توبہ کی شرط لگا دی ہے۔

تائب اور تارک میں فرق ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو تائب خیال کرتا ہے حقیقت میں وہ تائب نہیں بلکہ وہ تارک ہوتا ہے لیکن "تارکِ گناہ" اور "تائب از گناہ" میں بہت بڑا فرق ہے، بعض اوقات اس لیے آدمی گناہ کے ارتکاب سے بچا رہتا ہے کہ گناہ کا تصور اس کے دل میں نہیں آیا ہوتا، یا اس کے ارتکاب میں وسائل کا ہونا سنگِ راہ ہو جاتا ہے یا اس کے چھوڑنے کا باعث اللہ تعالیٰ کی خوشنودی نہیں بلکہ کوئی اور غرض ہوتی ہے اس لیے

اس طرح گناہ کے ارتکاب سے بچا رہتا ہے اور اس گناہ کا نہ کرنا توبہ نہیں کہلاتا بلکہ توبہ کے تو یہ معنی ہیں کہ وہ گناہ کو برائی سمجھے اور کسی فعل کی برائی کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس لیے ارتکاب کو ناپسند خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے اور اس کو چھوڑ دینے کا باعث صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال ہو کسی مخلوق کی بیم و امید اور کسی نفسانی غرض کا اس میں دخل نہ ہو، کیونکہ توبہ ایک عظیم الشان نیکی ہے اور ہر ایک نیکی میں اللہ تعالےٰ کے حکم کی پابندی اور اخلاص سب سے پہلی شرط ہے۔ جیسے کہ فضیل بن عیاض نے آیت "لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا" (الملك: ۲) کی تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ تم کو آزمانا چاہتا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سے کون ٹھیک اور خالص عمل بجا لاتا ہے۔"

حاضرین نے دریافت کیا ٹھیک اور خالص عمل کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ:

ان العمل اذا كان خالصا ولم يكن صوابا لم يقبل واذا كان صوابا ولم يكن خالصا لم يقبل حتى يكون خالصا وصوابا والخالص ان يكون لله والصواب ان يكون على السنة	جب کوئی عمل خالص ہو لیکن ٹھیک نہ ہو تو وہ مقبول نہیں ہوتا، اسی طرح اگر ٹھیک ہو لیکن خالص نہ ہو تو بھی مقبول نہیں ہوتا۔ جو عمل خالص بھی ہو اور ٹھیک بھی ہو، وہی مقبول ہوتا ہے اور خالص عمل وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا جائے اور ٹھیک وہ ہے جو سنت کے طریقہ پر کیا جائے۔

اس لیے میں نے ٹھیک اور خالص کی شرط لگائی ہے۔

حضرت عمرؓ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ کُلَّہٗ صَالِحًا وَّ اجْعَلْہُ لِوَجْھِكَ خَالِصًا وَّ لَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِیْهِ شَیْئًا	یا اللہ! میرے تمام اعمال نیک اور اپنے لیے خالص بنا دے اور ان اعمال میں کسی قسم کی برائی اور بدعملی کا دخل نہ ہونے دے۔

نوٹ:۔ توبہ کی مفصل بحث کسی دوسری جگہ درج ہے۔

مغفرت کا یقینی ذریعہ لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنے آپ کو عاجز جانتا ہے اور اس لیے وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور مغفرت طلب کرتا ہے مگر اس گناہ کو چھوڑتا نہیں تو ایسے شخص کے لیے مغفرت یقینی نہیں کیونکہ اس کی حیثیت تائب کی نہیں بلکہ ایک ایسے سائل اور دعا کرنے والے کی ہے جو گناہ سے بخشش تو مانگتا ہے مگر اس سے توبہ نہیں کرتا۔ اس کی بابت صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث موجود ہے:

ما من داع یدعو بدعوة لیس فیها اثم ولا قطیعة رحم الا کان بین احدی ثلث اما ان یعجل له دعوته واما ان یدخر له من الجزاء مثلها واما ان یصرف عنه من الشر مثلها قالوا یا رسول الله اذا نکثر	جو شخص کوئی ایسی دعا کرے اور کسی ایسی چیز کا سوال کرے جس کا حصول گناہ اور قطع رحم نہیں تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سلوک ہوتا ہے کہ یا تو بعینہٖ اس کا سوال منظور کر لیا جاتا ہے یا آخرت میں اس کو جزا دی جاتی ہے یا وہ اس دعا کی بدولت کسی شر اور مصیبت سے محفوظ رہتا ہے۔ صحابہؓ نے کہا،

قال الله اکنش	اللہ کے رسولؐ ہم زیادہ دعائیں کیا
----------------	کریں، آپؐ نے فرمایا اللہ کے پاس
----------------	بہت زیادہ ہے۔

الغرض اسی طرح بغیر سچی توبہ کے مغفرت طلب کرنا ایک دعا ہے جو عام دعاؤں کی طرح بموجب حدیثِ مذکورہ بالا کے خیر و برکت کا موجب ضرور ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کو مغفرت دی جائے۔ مغفرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب سچی توبہ ہو۔

پس اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ بعض علماء کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ گناہ پر مداومت کرنے کے باوجود مغفرت طلب کرنا جھوٹوں کی توبہ ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص اس کو توبہ سمجھتا ہے تو بے شک وہ جھوٹا ہے کیونکہ کوئی شخص تائب نہیں کہلا سکتا جب تک وہ گناہ کو ترک نہ کر دے۔ توبہ اور گناہ پر اصرار دونوں ضدیں ہیں۔

گناہوں کا استحضار اور مقبولیتِ توبہ

ترک اور ارتکاب گناہ سائل نے اپنے سوال میں یہ بھی دریافت کیا ہے کہ کیا کسی ایک گناہ کا اعتراف کر لینا اور اس سے تائب ہو جانا اس تمام عقوبت سے محفوظ رہنے کا موجب ہو سکتا ہے جس کا وہ متعدد گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے مستوجب ہے یا تمام گناہوں کا استحضار ضروری ہے؟ اس کا جواب چند اصولوں پر مبنی ہے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایک گناہ سے سچی توبہ کر لے اور دوسرے کے ارتکاب میں مشغول رہے۔ تب بھی یہ توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ابھی صرف ایک ہی گناہ کا تقاضا توبہ کے لیے زیادہ قوی تھا یا گناہ کا ایک ہی مانع زیادہ شدید تھا، اہل سنت کے سلف اور خلف کا یہی قول مشہور ہے۔ لیکن ابو ہاشم معتزلی اور متکلمین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ:

> "اس قسم کی توبہ صحیح نہیں، کیونکہ تائب نے دوسرے ذنوب ترک نہیں کیے اور اس کی توبہ کا محرک اور باعث اگر خدائے تعالیٰ کا ڈر اور خشیت ہوتی جس کے بغیر توبہ درست نہیں ہو سکتی، تو وہ دوسرے ذنوب میں مشغول نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ خدائے تعالیٰ کا ڈر سب گناہوں سے یکساں طور پر روکتا ہے۔"

قاضی ابو یعلیٰ اور ابن عقیل نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہی قول نقل کیا

ہے لیکن امام احمدؒ کا مشہور قول پہلے قول کے مطابق ہے اور سلف میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔

ابوہاشم کی دلیل کا جواب ابو ہاشم وغیرہ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات کسی ایک گناہ کی شدید قباحت انسان کے دل نشین ہوجاتی ہے اور دوسرے گناہوں کی قباحت کا تصور اس کے دل میں اتنا شدید نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس ایک گناہ سے تائب ہوتا ہے اور دوسرے گناہوں کے ارتکاب سے باز نہیں رہتا۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ کوئی شخص بعض فرائض تو بجالائے لیکن بعض دوسرے فرائض کا تارک ہو اور اس میں شک نہیں کہ دوسرے فرائض کا ترک کرنا اس کے لیے پہلے فرائض کی مقبولیت سے مانع نہیں، جن کو وہ بجالاتا ہے، نیز ممکن ہے کہ ایک ہی فریضہ دیگر فرائض کی بجاآوری کا موجب بن جائے۔

معتزلہ اور اہل کبائر مگر معتزلہ نے اپنے نزدیک ایک فاسد اصول مقرر کر رکھا ہے جس کو انہوں نے خارجیوں سے اخذ کیا ہے کہ وہ کافر اور گنہگار میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں:

ان اصحاب الکبائر یخلدون فی النار ولا یخرجون منھا بشفاعۃ ولا غیرھا	کبائر کا مرتکب ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور اس کے حق میں کوئی شفاعت وغیرہ کارگر نہیں ہوسکتی

ان کے نزدیک یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ عذاب دے اور پھر اس کو جنت میں داخل کرے اور اپنی رحمت اور عنایات کا مورد بنائے کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ:

یقولون بحبوط جمیع الحسنات بالکبیرۃ	کبیرہ کے ارتکاب سے تمام نیکیاں برباد ہوجاتی ہیں۔

سلف کا اعتقاد لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اہل سنت والجماعت کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اہل کبائر جنت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کے حق میں شفاعت قبول ہو سکتی ہے اور کبیرہ کا ارتکاب تمام نیکیوں کو برباد نہیں کرتا۔ تمام نیکیاں صرف کفر سے برباد ہوتی ہیں جیسے کہ تمام برائیاں توبہ سے زائل ہو سکتی ہیں اور کبیرہ کا مرتکب اگر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نیکیاں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان اعمال صالحہ کی جزا دے گا اگرچہ وہ ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے عذاب کا بھی مستوجب ہے۔ قرآن کریم میں زانی، سارق اور قاتل کو بلحاظ احکام شرعیہ کافر سے الگ صنف قرار دیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بات متواتر طور پر منقول ہے اور جس پر صحابہ کرامؓ نے اجماع کیا، وہ اسی قول کی تائید میں ہے۔ جیسا کہ کسی دوسری جگہ بالتفصیل بیان ہے۔

قبولیتِ اعمال اور اتقاء انہی اقوال کی بنا پر اس آیت شریفہ کی تفسیر میں مختلف اقوال مروی ہیں کہ:

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ۝ (المائدۃ: ۲۷)	بیشک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے اعمال ہی قبول فرماتا ہے۔

خوارج اور معتزلہ کا یہ قول ہے کہ:

"کوئی نیکی بارگاہِ کبریا تعالیٰ و تقدس میں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرتی جب تک اس کا کرنے والا کامل متقی نہیں۔ یعنی کسی کبیرہ کا مرتکب نہ ہو۔"

مرجیہ کہتے ہیں:

"متقی وہ ہے جو شرک سے اجتناب کرے۔ ان کے نزدیک اہل کبائر بھی متقی کے مفہوم سے باہر نہیں۔"

لیکن اہل سنت والجماعت کی تحقیق یہ ہے کہ:

"ایک ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے جس کے کرنے میں تقویٰ کے مفہوم پر عمل کیا گیا ہو یعنی اس کا وہ عمل اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تعمیل کے موافق ہے اور اس کے کرنے کی غرض محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ ہو۔

الغرض جو کوئی کسی عمل صالح کے بجالانے کے دوران میں اس عمل کے متعلق متقی ہے وہ عمل اس کا مقبول ہے چاہے کسی دوسرے عمل کے لحاظ سے وہ غیر متقی ہو لیکن اگر اس نے کسی نیکی کے کرنے میں تقویٰ کے مفہوم پر عمل نہیں کیا تو وہ عمل اس کا مقبول نہیں، چاہے وہ دوسرے امور میں اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار ہو۔"

خلاصہ یہ ہے کہ کسی ایک گناہ کی توبہ بھی مقبول ہے خواہ دوسرے گناہ کا مرتکب بنا رہے مقبولیت کے لیے ایمان ناگزیر ہے البتہ ایمان کا وجود سب اعمال کی مقبولیت کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ کلام مجید میں ہے:

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا ○ (بنی اسرائیل: ۱۹)	جو شخص آخرت کا طالب ہے اور اس کے لیے اس کے مناسب حال کوشش بھی کرتا ہے تو ایسے لوگوں کی کوشش ضرور ٹھکانے لگے گی، بشرطیکہ وہ مومن ہوں۔

اسی طرح یہ آیت پہلے گزر چکی ہے کہ،

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ ...	جس مومن مرد یا عورت نے نیک اعمال کیے، پس ایسے لوگ جنت

مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○	میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

الغرض قرآن کریم کی آیات کے تتبع سے تم کو معلوم ہو گا کہ جا بجا اعمالِ صالحہ کی مقبولیت اور ان پر جزا ملنے کے لیے ایمان کی شرط لگائی گئی ہے اور کفر کو تمام نیکیوں کا برباد کرنے والا قرار دیا ہے۔ کلامِ مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○	جو کوئی تم سے اپنے دین سے پھر جائے اور پھر وہ کافر ہو کر مرے تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہ لوگ دوزخ میں داخل ہو کر اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (البقرہ: ۲۱۷)

بخشش بوجہ قبولِ اسلام دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص متعدد گناہوں کا مرتکب ہے تو اگر وہ بعض گناہوں سے تائب ہو جائے اور دوسرے گناہوں پر مُصر رہے تو صرف اس کا وہی گناہ بخشا جائے گا جس سے اس نے توبہ کی۔ اس کے دوسرے گناہوں کا وہی حکم ہے جو غیر تائب کا ہوتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ البتہ ایک شخص جو پہلے کافر تھا اور اب مسلمان ہو گیا ہے اس کی بابت اختلاف ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ کفر کی حالت میں اس نے جتنے گناہ کیے تھے وہ سب بخشے گئے۔ کلامِ پاک میں ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ (الانفال: ۳۸)	کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے گزشتہ گناہ بخشے جائیں گے۔

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ:

اَلْاِسْلَامُ یَہْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ	اسلام قبول کرنے سے کفر کی سابقہ عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

ترکِ ارتکاب پر جزا لیکن بعض دوسرے علماء کا یہ قول ہے کہ اسلام کی بدولت صرف وہی گناہ بخشے جاتے ہیں جن کا ارتکاب اس نے ترک کر دیا ہے۔ برخلاف اس کے جن کبائر کا وہ بعد از اسلام بھی ارتکاب کر رہا ہے ان کی بابت اس کا وہی حکم ہے جو دوسرے مرتکبین کبائر کا ہے۔ اصول شرعیہ اور قرآن و حدیث کے نصوص یعنی تصریحات اسی قول کی تائید میں ہیں اور آیت قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا جس سے استدلال کیا گیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ:

"جن گناہوں کے ارتکاب سے وہ باز آ جائیں تو اس سے پہلے ان گناہوں کا جتنا بھی انہوں نے ارتکاب کیا ہے وہ معاف کیا جائیگا۔"

محاورہ بھی یہی ہے کہ کسی سے کہا جائے اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارا گزشتہ قصور معاف کر دیا جائے گا تو اس کے بلاشک و شبہ یہی معنی ہوتے ہیں کہ اگر تم اس امر کو جس کا تم ارتکاب کرتے ہو، ترک کر دو تو گزشتہ ارتکاب کی بابت تم پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ تمہارے دوسرے گناہ اور دوسری تقصیریں بھی معاف کر دی جائیں گی۔

اعمالِ جاہلیت کا مواخذہ صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے آپ سے استفسار کیا کہ جو اعمال ہم نے جاہلیت میں کیے تھے کیا ان کی بابت بھی ہم پر مواخذہ ہو گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا:

من احسن منکم فی	جس نے اسلام میں اپنی حالت کو

الاسلام لم یؤاخذ بما عمل فی الجاھلیۃ ومن اساء فی الاسلام اخذ فی الاول والآخر	اچھا بنالیا اس پر اعمال جاہلیت کی بابت کچھ مواخذہ نہیں ہو گا لیکن جس نے اسلام کی حالت میں بھی برائیاں کیں۔ اس پر اگلے پچھلے گناہوں کا مواخذہ ہو گا۔

اس حدیث نے نہایت صاف الفاظ میں مؤخر الذکر قول کے حق میں فیصلہ فرما دیا ہے الاسلام یہدم ما کان قبلہ میں چونکہ ایک گونہ اجمال ہے، اس لیے اس حدیث کو اس کے لیے بمنزلہ تفسیر اور بیان کے سمجھنا چاہیئے۔

توبۂ مطلق اور توبۂ عام وخاص

غفران الذنوب کلھم تیسرا اصول یہ ہے کہ بعض اوقات انسان خاص خاص گناہوں کا استغفار کرتا ہے یعنی اپنے دل میں ان کا تصور باندھتا اور ان سے تائب ہوتا ہے اور بعض اوقات مطلق توبہ کرتا ہے مگر ذنوب کا استغفار کچھ بھی نہیں کرتا بلکہ اس کی نیت عام گناہوں سے توبہ کرنے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ عام گناہوں سے تائب ہونے اور عام توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اس نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ ہر ایک مامور کو عمل میں لائے اور ہر ایک ممنوع اور منہی عنہ کو چھوڑ دے اور اس کے ضمن میں تمام گناہوں کے متعلق ایک عام ندامت[1] پائی جاتی ہے، جیسا کہ مسند

[1] ندامت کی مختلف اقسام بیان کی گئے اعتقادات، ارادت اور آلام کے ایذاء، لذات وحظوظ مانند غم وحزن اور فرح وسرور جو نفس انسانی کو لاحق ہوتے ہیں، اس کا احساس کرایا جاتا ہے جو ترک کر دیا ہے۔

میں ابن مسعودؓ کی ایک روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الندم توبۃ | ندامت بھی ایک قسم کی توبہ ہے۔

جب ظاہر ہو جائے کہ تائب جو عام توبہ کرتا ہے تو ایسی توبہ سے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں، اگرچہ ہر ایک گناہ کا جداگانہ تصور ذہن میں نہ ہو لیکن اگر اس عام توبہ کے خلاف واقع ہوگی تو توبہ خاص کہلائے گی۔

کونسا گناہ عام توبہ سے نہیں بخشا جاتا البتہ اگر کوئی ایسا گناہ ہے کہ اگر وہ اس کے ذہن میں مستحضر بھی ہو جاتا تو وہ اس سے تائب نہ ہوتا کیونکہ اس گناہ کے چھوڑنے کی بابت ابھی اس کے دل میں عزیمتِ راسخہ پیدا نہیں ہوئی جو اس کو آمادہ عمل کرے یا وہ ایک ایسا گناہ ہے جس کو بزعم خود قبیح سمجھتا ہی نہیں تو اس قسم کا گناہ عام توبہ کے ضمن میں نہیں آتا اور جب تک خصوصیت کے ساتھ اس گناہ سے توبہ نہ کرے' اس کے بخشے جانے کی یقینی توقع نہیں کی جا سکتی کیونکہ یقینی مغفرت کا ذریعہ صرف توبۂ مقبولہ ہے اور بس۔

عام توبہ اور مجمل توبہ لیکن اگر کوئی شخص ہر ایک گناہ سے توبہ کرنے کا التزام نہیں کرتا مگر کسی گناہ کی تخصیص بھی نہیں کرتا تو اس قسم کی توبہ" توبۂ مجمل" کہلاتی ہے اور اس کے مفہوم میں سب گناہ داخل نہیں سمجھے جاتے اور اس لیے وہ عام مغفرت کا موجب بھی نہیں قرار دی جا سکتی، توبہ عامہ اور توبۂ مجمل کا فرق ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ کیوں کہ ہر ایک کا حکم جداگانہ ہے۔

صفتِ حقائقِ ایمانیہ اکثر لوگ توبہ کرتے وقت (خواہ ان کی توبہ عام بھی ہو) فقط بعض فحش گناہوں کا استحضار کرتے ہیں یا ہاتھ اور زبان سے صادر شدہ گناہ اِن کے پیش نظر ہوتے ہیں حالانکہ وہ ظاہر یا باطن میں ایسے امورِ شرعی کا تارک ہوتا ہے جس کا بجالانا اس پر فرض ہے اور وہ حقائقِ ایمانیہ کا ایک ایسا اہم شعبہ ہوتا ہے

جس کا ترک کرنا ان فواحش کے ارتکاب سے بہت زیادہ مضر ہوتا ہے، جن کا تصور اس کے ذہن میں ہے، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جن حقائقِ ایمانیہ کے ساتھ موصوف ہونے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جن کی بدولت انسان سچے مومنوں کے زمرہ میں داخل ہوتا ہے وہ بعض ظاہری گناہوں کے ترک کر دینے سے بہت زیادہ نافع ہوتا ہے۔

اللہ اور رسُول کی محبّت مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے دل کو معمور رکھنا اعمالِ حسنہ کی عظیم ترین نیکی ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک صحابی تھا جو حمّار کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ اکثر شراب پیا کرتا تھا چنانچہ کئی مرتبہ اس کو شراب پیتے پکڑا بھی گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شراب نوشی کی سزا دی۔ ایک شخص نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کہا کہ:

"اس پر خدا کی لعنت ہو، کتنی دفعہ سزا یاب ہوا، پھر بھی اپنی کرتوت سے باز نہیں آتا"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا:

لا تلعنه فانه يحب الله ورسوله	اس پر لعنت نہ کرو، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے

تم جانتے ہو کہ شراب کے پینے والے اور نچوڑنے والے پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے لیکن ایک ایسے شخص پر جو پکا مے نوش ہے، صرف اس کے لیے لعنت بھیجنے سے منع فرمایا کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت موجود ہے۔

اسی طرح جو آیتیں اور حدیثیں مطلق تکفیر اور مطلق وعید کے مضمون پر مشتمل ہیں وہ بعض شرائط کے ہونے اور بعض موانع کے نہ ہونے کے ساتھ مشروط

ہیں۔ مثلاً جو شخص کسی گناہ سے تائب ہو جائے اس کے لیے وعید نہیں۔ تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے، یا مثلاً جس شخص کی نیکیاں اس قدر زیادہ ہوں کہ اس کے گناہوں کو مٹا دینے کے لیے کافی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

عقوبت ٹل جانے کے اسباب جن گناہوں کے ارتکاب پر دوزخ کی سزا مقرر ہے۔ اس عقوبت کے ٹل جانے کے متعدد اسباب ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں

سچی توبہ ——— کثرتِ اعمالِ صالحہ ——— اس دنیا کے مصائب
اور شدائد میں مبتلا ہونا ——— برزخ اور میدانِ قیامت کی سختیاں
نیز مومنوں کی دعا ——— اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

یہ سب ایسے اسباب ہیں جو اعمالِ سیئہ کی کفارت کا باعث اور خدا کی مغفرت کا موجب ہوتے ہیں۔

بہرکیف اگر توبہ کسی خاص گناہ سے کی گئی ہے یا توبہ "مجمل" ہے تو اس سے عام مغفرت کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، برخلاف اس کے "توبہ عامہ" سے سب گناہ بخشے جاتے ہیں لیکن اکثر لوگ توبہ عامہ نہیں کرتے، حالانکہ ہر ایک شخص کو اس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر ایک شخص کم و بیش مامورات شرعیہ کے بجا لانے میں کوتاہی کرتا ہے اور بعض منہیات کا ظاہر یا باطن میں مرتکب ہوتا ہے، اس لیے ہر ایک شخص پر ہر ایک حالت میں توبہ کرنا لازم ہے۔ کلام پاک میں ہے،

وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (النور: ۳۱)	اے مومنو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرتے ہوئے پھر آؤ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم فلاح پاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے کا طریقہ

مفہوم توحیدِ ربوبیت سائل کا آخری استفسار یہ ہے کہ اس میں کیا راز ہے کہ مصیبت تب دور ہوتی ہے جبکہ آدمی تمام لوگوں سے اپنی امید کا رشتہ منقطع کرے اور مخلوقات سے اپنی امید قطع کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی تدبیر کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تدبیر توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت دونوں قسم کی توحید پر ثابت قدم رہنا ہے۔ توحیدِ ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک اللہ تعالےٰ کو تمام اشیاء کا خالق اعتقاد کرے اور یہ کہ اس کے بغیر کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا کہ کوئی بات باستقلال اس سے ظہور میں آ سکے، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہو سکتا، اس لیے سوائے اللہ تعالیٰ کے جو کوئی بھی ہو اگر بالفرض کسی بات کے ظہور میں آنے کا اس کو سبب مانا جائے، تب بھی وہ اس کے انجام دینے میں کسی معاون کا بالضرور محتاج ہو گا اور لامحالہ اس کا کوئی ایسا ضد اور شریک بھی ہو گا جو اس کو اپنے ارادے کی تنفیذ سے روک سکے، اس لیے اپنی مرادیں اور اپنی حاجتیں صرف اللہ تعالےٰ سے مانگنا چاہیے۔

افعالِ اختیاریہ میں عجزِ انسانی سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسروں کی بے بسی کی تو یہ کیفیت ہے کہ جو افعالِ اختیاریہ کہلاتے ہیں ان کے کرنے میں بھی انسان مستقل نہیں بلکہ سراسر اللہ تعالیٰ کی اعانت کا محتاج ہے۔ جب تک وہ اس کے دل میں عزمِ راسخ

پیدا نہ کرے، جو انسان کو آمادۂ عمل کرتا ہے اور بعد ازاں اس کے اعضاء اور جوارح میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ قدرت موجود نہ ہو جو حدوثِ فعل کے لیے شرط ہے۔ اس وقت تک کسی فعل کا ظہور میں آنا ناممکن ہے اس لیے یہ کہنا کہ:

مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ	اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا

اپنے وسیع ترین معنوں میں بالکل درست ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ أَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۞ وَ مَا تَشَآءُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (التکویر: ۲۸، ۲۹)	یہ تم میں سے اس شخص کے لیے ہے جو راست روی چاہتا ہے۔ تم نہیں چاہو گے مگر جب اللہ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۞ وَ مَا تَشَآءُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۞ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط وَ الظّٰلِمِيْنَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا (الدھر: ۲۹ تا ۳۱)	جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے تم کچھ نہیں چاہو گے مگر جب اللہ تعالیٰ چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل فرماتا ہے اور ظالموں کے لیے درد دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سب سے بڑی ذلت | جو شخص اپنے جیسی مخلوق سے کسی مراد کا طالب ہے وہ ایک عاجز کے سامنے دستِ نیاز پھیلا کر اپنے آپ کو مفت میں ذلیل کرتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (الاعراف: ۱۹۴)	بے شک جن کو تم اپنا حاجت روا سمجھ کر پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح خدا کے محتاج بندے ہیں۔

یہ ایک ایسا شرک ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرماتا۔ فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النسآء: ۴۸، ۱۱۶)	بے شک جس کسی نے شرک کیا، اللہ تعالیٰ اسے ہرگز نہیں بخشے گا۔ ہاں اس کے سوائے جسے چاہے گا بخش دے گا۔

عرفانِ الوہیت دوسری تدبیر توحیدِ الوہیت کی حقیقت پر کاربند ہونا ہے جس کا مفہوم پہلے بھی بیان ہو چکا ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ سے کامل محبت رکھنا، اسی کا حکم ماننا، اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا، اپنی بیم وامید کا مرکز اسی کو قرار دینا، اسی سے اپنی حاجتوں کے لیے سوال کرنا اور اسی کے آگے سر جھکانا وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر کوئی شخص دونوں قسم کی توحید پر ثابت قدم رہے تو زہے سعادت! یہ شخص دنیا اور آخرت میں نہایت خوش قسمت انسان ہے ——— لیکن اگر وہ اس قسم کا آدمی ہے جس کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ:

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (یونس: ۱۲)	جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لیٹے ہوئے اور بیٹھے اور کھڑے ہمیں پکارتا ہے لیکن جب ہم اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گزرا چلا جاتا ہے گویا اس نے کبھی کسی تکلیف کو دور کرنے کے لیے

------------	ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔

یا وہ ان اشخاص میں سے ہو جس کا بیان اس آیت میں ہے:

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي	جب تمہیں سمندر میں تکلیف پیش
الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ	آتی ہے تو جن کو تم پکارا کرتے ہو، وہ
إِلَّا إِيَّاهُ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى	سب بھول جاتے ہیں اور صرف
الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ	خدا کی طرف رجوع کرتے ہو لیکن
الْإِنْسَانُ كَفُورًا	جب وہ تم کو نجات دے کر خشکی پر
------------	لا تا ہے تو تم روگردانی کرتے ہو۔
(بنی اسرائیل: ۶۷)	اور انسان ہے ہی روگردانی کرنے والا۔

ایسے آدمیوں کے لیے ان کا اعتراف توحید ایک حجت ہے جو قیامت کے دن ان کے برخلاف فیصلہ دلانے کا موجب ثابت ہوگی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان مشرکین کو جو صرف توحید ربوبیت کے قائل تھے اور توحید الوہیت کے مقتضا پر عمل پیرا نہیں تھے، ان کے اپنے اقرار اور تسلیم کی وجہ سے انہیں جھوٹا ٹھہرایا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ	(اے نبیؐ! ان منکروں سے) پوچھیے
فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ	اگر تم جانتے ہو تو بتلاؤ کہ زمین اور
سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا	تمام مخلوقات جو اس میں ہے کس کے
تَذَكَّرُونَ قُلْ مَنْ	لیے ہے؟ وہ فوراً کہیں گے، اللہ
رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ	کے لیے۔ پھر آپ فرمائیں، کیا تم
وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ	غور نہیں کرتے؟ آپ ان سے پوچھیں
سَيَقُولُونَ لِلَّهِ قُلْ أَفَلَا	وہ کون ہے جو سارے آسمانوں کا

تَتَّقُوْنَ قُلْ مَنْ بِیَدِہٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُوَ یُجِیْرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ	پروردگار ہے اور جہانداری کے عرشِ عظیم کا مالک ہے ؟ وہ کہیں گے یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے۔ پھر آپ فرمائیں تمہیں کیا ہوگیا کہ شرک کے نتیجہ سے نہیں ڈرتے، آپ ان سے پھر پوچھیں وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی بادشاہی ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے اور کوئی نہیں جو اس کے اوپر پناہ دینے والا ہو، وہ کہیں گے یہ صفتیں تو اللہ ہی کے لیے ہیں، آپ فرمائیں، پھر تم پر کون سا جادو کیا گیا ہے کہ راہِ حق سے منحرف ہوئے جاتے ہو؟
(المومنون: ۸۴ تا ۸۹)	

اور فرمایا،

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ	اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو کس نے مطیع بنایا تو وہ ضرور اس کے جواب میں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا۔ کہہ دو کہ پھر تم کیوں پھرے جاتے ہو [1]
(العنکبوت: ۶۱)	

[1] یعنی توحیدِ ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے کیوں توحیدِ الوہیت پر عمل پیرا نہیں ہوتے حالانکہ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں

الغرض قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ مضمون دوہرایا گیا ہے۔

نزولِ مصائب، نعمتِ عظمٰی حقیقت میں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ وہ اپنے مومن بندوں پر مصائب اور شدائد نازل فرماتا ہے، جن کی بدولت وہ توحید پر مائل ہونے اور خاص اللہ تعالیٰ کو پکارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس حالت میں ان کی بیم و امید کا مرجع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں توکل اور انابت پیدا ہوتی اور شرک سے بیزار ہو کر ان کے قلوب نورِ ایمان کے ساتھ معمور ہوتے ہیں اور یہ ایک نعمتِ عظمٰی ہے جو مرض اور خوف کے زوال اور فراخیٔ رزق کے حصول سے بدرجہا بڑھ کر ہے کیونکہ مرض اور مصیبت کا زوال اور فراخیٔ رزق وغیرہ جسمانی راحتیں اور دنیاوی خوشیاں ہیں جو کافروں کو چند روزہ حاصل ہوتی ہیں لیکن ان سے بدرجہا بہتر وہ توحید خالص ہے جو ایک ابدی سعادت ہے اور لذت و حلاوت جو مخلص موحدین کو اس سے حاصل ہوتی ہے، اس کا لفظوں میں اظہار کرنا دشوار ہے۔ ہر ایک مومن موحد کو بقدر اس کے ایمان اور درجہ توحید کے اس سے حصہ ملتا ہے، اسی بنا پر سلف صالحین میں سے کسی ایک نے کہا ہے کہ:

يَا ابْنَ آدَمَ لَقَدْ بُوْرِكَ لَكَ حَاجَةٌ أَكْثَرْتَ فِيْهَا مِنْ قَرْعِ بَابِ سَيِّدِكَ	اے بنی آدم! تمہیں تمہارا محتاج ہونا مبارک ہو۔ اس تقریب سے تم کو اپنے مولائے کریم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی سعادت حاصل ہوگی۔

ہجومِ مشکلات اور حلاوتِ مناجات ایک شیخ طریقت کا قول ہے کہ:

"بعض اوقات مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے جس کے رفع ہونے کے لیے بارگاہِ الٰہی تعالیٰ شانہٗ میں ملتجی ہوتا ہوں۔ اسی اثنا میں مجھ کو وہ حلاوتِ مناجات میں حاصل ہوتی ہے کہ میں نہیں چاہتا

کہ میری حاجت جلد پوری ہو۔ ڈر یہ ہوتا ہے کہ پھر میرا نفس اس خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرے گا، کیونکہ نفس ہمیشہ اپنے حظوظ کا خواہش مند ہوتا ہے اور اگر اس کی حاجت پوری ہو جائے تو پھر کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔"

خاتمۂ کتاب

بعض کتب سابقہ میں آیا ہے کہ:	اے آدم کے بیٹے! مصیبت میں
یا ابن آدم البلاء یجمع	تمہارا تعلق میرے ساتھ ہو جاتا ہے
بینی و بینک و العافیۃ	اور عافیت میں تمہارا تعلق اپنے نفس
تجمع بینک و بین نفسک	کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور ہر ایک سچا مومن اپنے باطن میں اس حلاوتِ ایمان کا ادراک کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ کسی میں ایمانی ذوق اور وجدان کی کمی ہو۔ کیونکہ وہ حالت جو صاحبِ ایمان کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ پاتا ہے، اس کا دل خالص اللہ تعالیٰ کی محبت سے معمور ہوتا ہے، اس کا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک پر ہوتا ہے، اس

ؒ کاش انسان کو اس حالت پر ثابت قدم رہنا نصیب ہوتا لیکن یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ ادھر سختی اور تکلیف دور ہوئی ادھر توحید کا فور ہوئی۔ فَاللّٰہُ ھُوَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْهِ التُّکْلَانُ

کا حُبّ اور بغض کسی اور کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے اور اس کی امید و بیم کا مرجع اسی کی ذاتِ پاک ہوتی ہے۔ وہ خاص اسی کی عبادت کرتا ہے اور فقط اس سے توفیق اور اعانت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی ارادہ نہیں کرتا، بلکہ اس نے اپنا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی مرضی میں فنا کر دیا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کا صرف ذوق اور وجدان ہی سے ادراک ہو سکتا ہے ؎

ذوقِ ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی !

ہر ایک مومن کو اس کا کم و بیش حصہ عنایت ہوا ہے اور یہ دینِ اسلام کی وہ حقیقت ہے، جس کی اشاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو بھیجا اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں اور قرآن کریم کی تعلیم کا مرکز و محور بھی یہی ہے۔

وَفَّقَنَا اللّٰہُ تَعَالیٰ لِذٰلِکَ وَاللّٰہُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ وَحُکْمُہٗ اَحْکَمُ۔

مرکز الدعوۃ الاسلامیہ کی مطبوعات

- العبودیۃ ــــــ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ
- الفرقان ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃
- کتاب الکبائر ــــــ شیخ الاسلام امام محمد بن عبدالوہاب علیہ الرحمہ
- اصول دین ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
- فضل الاسلام ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
- دین کے چار بنیادی اصول ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
- فضائل قرآن ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
- اصول ایمان ــــــ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
- الورد المصفیٰ المختار ــــــ المغفور جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود
- دعوت الی اللہ اور مبلغین کے اوصاف ــــــ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز عبداللہ بن باز حفظہ اللہ
- حج و عمرۃ قرآن وسنت کے آئینے میں ــــــ 〃 〃 〃
- عید میلاد النبی کی شرعی حیثیت ــــــ 〃 〃 〃
- احادیث قدسیہ ــــــ دکتور عزالدین ابراہیم حفظہ اللہ
- حیات صحابہ کے درخشاں پہلو ــــــ دکتور عبدالرحمان رافت الباشا
- سگریٹ نوشی ــــــ سماحۃ المفتی محمد ابراہیم حفظہ اللہ
- عقیدۃ طحاویۃ ــــــ علامہ ابو جعفر الوراق الطحاوی حفظہ اللہ

مندرجہ بالا کتب کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ **محمود احمد غضنفر کے قلم سے**

مكتبة ابن تيمية

توزيع

من

رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد

بالرياض

المملكة العربية السعودية